تاریخ اسلام

तारीख़े [illegible]
३००२७

تاریخ اسلام

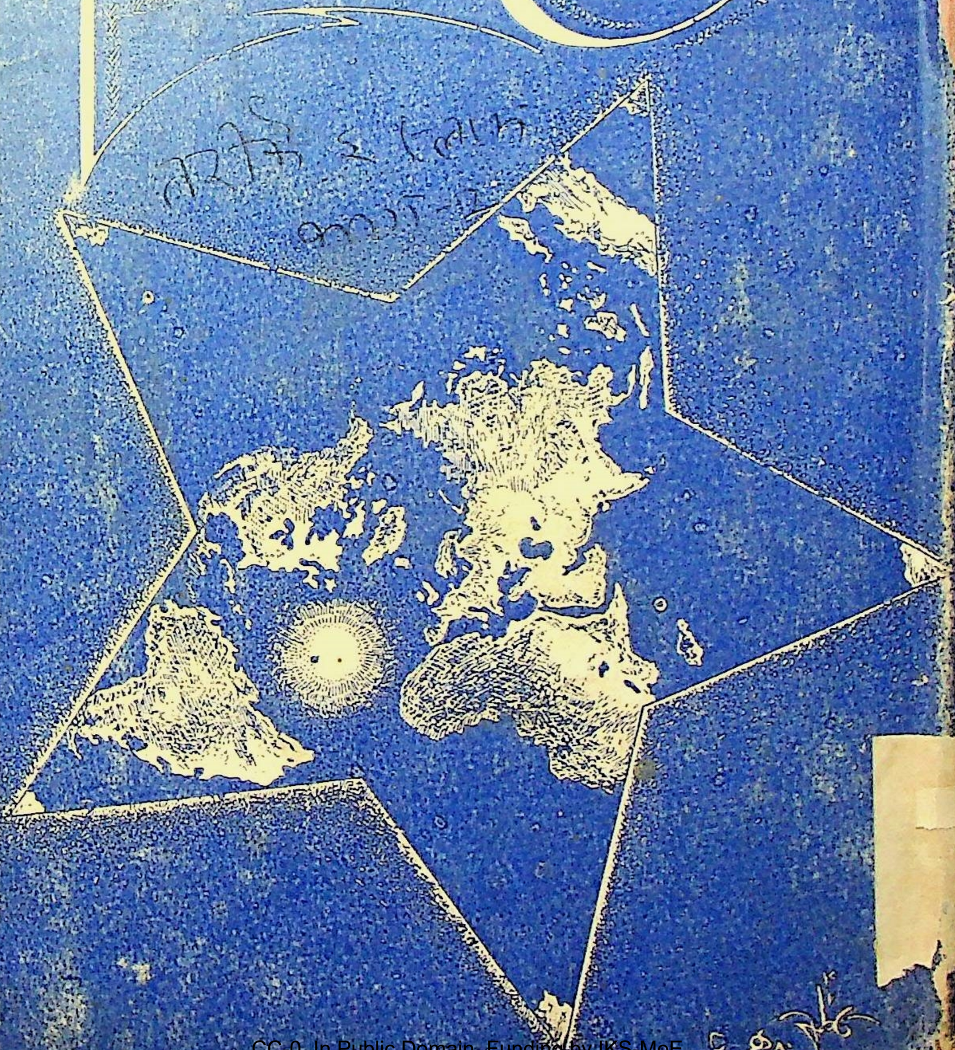

[illegible]

تاریخ اسلام

[illegible]

سلسلۂ اشاعت امامیہ مشن ۔ لکھنؤ، ۳۵۹

تاریخ اسلام

حصّۂ اوّل

از قلم

سرکار سیّد العلماء الحاج مولانا السیّد علی نقی النقوی دام ظلہ

مطبوعۂ سرفراز قومی پریس لکھنؤ

امامیہ مشن کی طرف سے

ایک مہتم بالشّان خدمت کا آغاز

اردو زبان میں ایک صحیح معنی میں اسلامی تاریخ کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اردو کیا، دوسری زبانوں میں بھی اس کی ضرورت محسوس ہوتی رہی ہے، اس لیے کہ ملتِ جعفریہ کے افراد، جو واقعاً اسلامی روایات کے ورثہ دار ہو سکتے تھے، شروع سے سیاسی طاقتوں کے ظلم و جور کا نشانہ بنے رہے۔ اس لیے ان کا یہی بہت بڑا کارنامہ تھا کہ انھوں نے عقائد و احکام شرعیہ کو ان کی اصلی صورت میں "جو شیعی علم کلام" اور "فقہ جعفری" کی صورت میں ہے، محفوظ کر دیا۔ مگر تاریخ پر جو کتابیں لکھی گئیں، وہ عموماً اس طبقہ کی طرف سے جو حکومتوں کے زیر سایہ پھل پھول رہا تھا، لہذا تاریخ اسلام اپنی اصلی شکل میں سامنے نہیں آسکی۔

شکر ہے کہ سرکار سید العلماء مدظلہ نے اس ضرورت کی تکمیل کا بیڑا اٹھا لیا ہے، اور فعلاً اس سلسلہ کی پہلی کڑی جس میں ہجرت حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کے واقعات ہیں پیش کی جا رہی ہے۔ خدا کرے کہ افرادِ ملت امامیہ مشن کی اس پیش کش کا شایانِ شان استقبال فرمائیں اور ہم بہت جلد اس کے بقیہ حصص بھی شائع کر سکیں۔

ربیع الثانی سنہ ۱۳۸۱ھ

خادم ملت
سیّد ابن حسین نقوی عفی عنہ
آنریری سکریٹری امامیہ مشن لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الانبیآء والمرسلین وآلہ الطاہرین ۔

آغازِ آفرینش

اللہ ہی اللہ تھا اور کچھ نہ تھا۔ پھر اُس کی مشیّت کے اشارہ سے ایک جوہر نور پیدا ہوا جس سے عدم کی ہمہ گیر ظلمت وجود کی صلاحیتوں سے جگمگا اُٹھی۔ اس ایک نور کے احاطہ میں تیرہ نور اور چمک رہے تھے۔

ان انوار کی کرنوں میں جو فضا بن کر محیط ہوئیں اس کے بعد تو لاکھوں چھوٹے بڑے نور اپنی اپنی تڑپ دکھانے لگے۔

زمانہ تھا نہیں تاکہ وقت بتایا جا سکے کہ کب تک یہ عالم رہا۔ پھر عمومی طور پر ارواح کی پیدائش ہوئی جنھوں نے روشنی کے ساتھ ماسوی اللہ کے لیے زندگی کی ہوا چلائی۔ قیامت تک کی پیدا ہونے والی ذی روح مخلوق آج اپنے ارادہ و شعور کے جوہر سمیت جمع تھی اور اس وقت خالق نے ان سے اپنی معرفت اور اطاعت کا اقرار لیا اور سب نے اس کا عہد و پیمان باندھا۔ نہ کہنے والے کو خطاب میں زبان درکار تھی۔ نہ سننے والوں کو کانوں کی احتیاج۔ وہ جسم و جسمانیت سے بری اور یہ بھی ابھی جسمیت سے

بے لوث ۔ اس سوال و جواب کا مضمون جب ہمارے سنانے کے لیے الفاظ کے قالب میں آیا تو الست بربکم کے سوال اور بلیٰ کے جواب سے اُس کا ماحصل معلوم ہوا ۔

روح کے بعد مادہ کی باری آئی ، مادہ کے ساتھ ساتھ صورت کی جلوہ گری ہوئی ۔ پہلی صورت جس کا عالم مادی میں پتہ چلتا ہے مادہ پانی اور ہوا کی ہے ۔ نیچے پانی اور اوپر ہوا ۔ پھر ہوا کے جھونکے اس پانی کے اندر چلے اور ان کے تھپیڑوں سے اس پانی میں تموج پیدا ہوا ۔ پانی کے جوش و خروش سے کف پیدا ہوا اور بخارات بلند ہوئے ۔ یہ بخارات فضائے ہوا میں بلند ہو کر محیط ہو گئے ، جو آسمان کہلائے اس میں سات طبقے قرار دیے گئے اور ان ساتوں آسمانوں میں ملائکہ کی عظیم الشان بستی بسائی گئی ۔ یہ مادی کثافتوں اور گناہ کی آلائشوں سے بری ، پاک مخلوق ہیں ، جن کا کام صرف اللہ کی عبادت اور اطاعت کرنا ہے ۔ عالم طبیعت کے انتظام و تدبیر کا کام ان کے سپرد کر دیا گیا کہ وہ اُسے احکام الٰہی کے ماتحت انجام دیں ۔

انھیں آسمانوں میں ہزاروں ثوابت اور سیارے چمکائے ان میں کوئی سورج ہے اور کوئی چاند اور کچھ ستارے ہیں جو سورج کے اردگرد چکر لگاتے ہیں ۔

پانی کی سطح پر تھوڑے حصہ میں خالق کے ارادے نے اُسی کف کی موٹی تہہ ایسی جما دی ، جیسے دودھ پر بالائی ہوتی ہے ۔ اس تہہ کا نام

زمین ہوا۔ اور جس جگہ سے یہ جمنا شروع ہوئی تھی اُسی کا نام مکہ قرار پایا۔ جہاں مسلمان حج کو جاتے ہیں، مگر زمین کے اِدھر اُدھر چاروں طرف اور پھر نیچے، پانی ہی پانی تھا، جو تھپیڑیں مار رہا تھا۔ اس لیے وہ ڈانواں ڈول اور بیقرار تھی۔ اسے بھاری بھرکم بنانے کے لیے پہاڑ پیدا ہوئے، جو اس میں میخوں کی طرح گڑ گئے۔ پہاڑوں سے چشمے پھوٹے جنھوں نے خشک زمینوں کی سیرابی کا انتظام کیا۔ اونچے اونچے ٹیلے اور دور افتادہ مقامات، جن تک چشموں کا پانی نہیں پہنچ سکتا تھا، ان کے لیے بادل پیدا ہوئے، جو پانی کا خزانہ لے کر سفر کرتے اور ان دور افتادہ مقامات کو اپنی بارش سے سیراب کرتے ہیں۔

اب ان چشموں کی آبیاری اور ان بادلوں کی آب پاری سے زمین کی سوئی ہوئی نمو کی طاقتوں نے کروٹ لی۔ اس میں زندگی پیدا ہوئی، سبزہ لہلہانے لگا اور طرح طرح کے درخت، بیل بوٹے سطح زمین پر جھومنے اور لہریں لینے لگے اب عالم میں رنگ و بو کی کوئی کمی نہ تھی مگر سوا سمندر کے خروش اور چشموں کی روانی، یا کبھی بادلوں کی کڑک اور گرج کے کوئی آواز نہ تھی۔ مگر جب ان درختوں کے پھلوں اور پتیوں نے خوان رزق چن دیا تو عالم کے سناٹے کو چہل پہل سے تبدیل کرنے کے لیے بہت سی جاندار مخلوق، رنگ برنگ کے حیوانات، عدم کے سمندر سے نکل نکل کر وجود کے ساحل پر اکٹھا ہونے لگے۔ اور چرند، پرند، بہائم اور درندوں کا ایک جمگھٹا لگ گیا اور شور برپا ہوگیا۔

مگر اس مخلوق میں حرکت اور ارادے کی تنظیم کے لیے شعور نہ تھا۔ یہ پوری کارگاہ ڈکتے ہوئے شیروں، لپکتے ہوئے بھیڑیوں اور ڈسنے والے اژدہوں سے محشرستان بنا ہوئی تھی۔ اس کی تنظیم کے لیے پہلے آگ سے پیدا کی ہوئی ایک مخلوق بنی جان کو برسرکار لایا گیا کہ اس نوع کو موقع آزمائش میں لا کر اس کو اپنی صلاحیتوں کی حد کا اندازہ کرا دیا جائے۔ اس نے اپنی بڑھی ہوئی حرارت مزاج سے اس دنیا میں غیظ و غضب کی آگ بھڑکا دی اور دوسری کائنات میں نظم و ضبط پیدا کرنے کے بجائے خود باہمی جنگ و جدل اور خونریزی سے فساد عظیم برپا کیا۔ اور اپنے خالق کی اطاعت چھوڑ کر اُس کے احکام کی خلاف ورزی شروع کر دی۔

اس وقت آسمانوں پر نور کی پیداوار مخلوق تھی، جسے ملک کہتے ہیں اور زمین پر تارکی پیداوار تھی، جسے جن کہتے ہیں۔ وہ ہمہ تن اطاعت و عبادت تھے اور یہ ہمہ تن کفر و معصیت بن گئے۔ اس لیے وہ ان کو دیکھ کر نالاں تھے۔ آخر خالق کا غضب نازل ہوا اور یہ پوری کی پوری قوم اس زمین سے بیدخل کی گئی۔ ان میں سے ایک جو اُس وقت تک عابد و زاہد نظر آتا تھا، اپنی اس عبادت کے نتیجہ میں بچا لیا گیا، اور اُسے عالم بالا کے بسنے والے ملائکہ کی صفوں میں جگہ دے دی گئی۔ جہاں وہ ان کے ساتھ ایسا گھل مل گیا، جیسے کہ ان ہی میں سے ہے۔ اس کا نام عزازیل تھا، جو بعد میں ابلیس

اور شیطان کہلایا۔

اب خالق کی طرف سے فرشتوں کے درمیان ایک اعلان ہوا کہ میں زمین پر اپنی طرف سے ایک نائب مقرر کرنے والا ہوں۔ فرشتے جو بنی جان کی خونریزی اور فساد کو دیکھ چکے تھے کہنے لگے کہ کیا ایسے کو مقرر کیا جائے گا، جو زمین میں فساد برپا کرے اور خونریزی، حالانکہ ہم تیری تسبیح اور تقدیس کرتے ہیں۔ جواب ملا کہ میں جو جانتا ہوں اس کو تم نہیں جانتے۔ یعنی میرے کاموں میں، جن کی حکمتیں راز میں ہیں۔ تمہیں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ ملائکہ خاموش ہو گئے۔ پھر ایک دفعہ یہ اعلان ہو گیا کہ میں ایک مخصوص نوع مخلوق، بشر کو مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں۔ جب میں اس کا پتلا تیار کر لوں اور اُس میں اپنی پسند کی ہوئی خاص روح داخل کر لوں، تو تم سب اس کے لیے سجدہ میں جھک جانا۔ اسے سب نے سن لیا اور اس وقت کسی نے انکار نہیں کیا۔

اب خالق نے اپنی قدرت کے انتظام خاص سے، شور و شیریں، ہموار و ناہموار، ہر طرح کی زمین سے، خاک یکجا کرائی۔ پانی کی شرکت سے اُس کا ایک پیکر تیار ہوا، جسے ہواؤں نے خشک کھنکر بنا دیا اور اُس کو اپنی پسندیدہ روح ڈال کر خدا نے جاندار بنایا۔ یہ انسان اول ابو البشر آدمؑ تھے۔

اب ملائکہ کو حکم ہوا کہ اس کے سجدے کے لیے جھک جاؤ۔ سب نے تو

پیشانیاں سجدہ میں رکھ دیں مگر عزازیل نے انکار کر دیا، اور کہا کہ میری خلقت آگ سے ہے، جو محل میں خاک سے بلند ہے۔ پھر بھلا میں اس کو کیونکر سجدہ کروں۔ یہ اُس کا تکبر اور انکار غضب خالق کا سبب بنا، اور حکم ہوا کہ نکل جا ملأ اعلیٰ اور صفوف ملائکہ سے وہ نکل تو گیا، مگر اس نے انسان کی بلندی کے دعوے کو شکست دینے کے لیے خالق سے قیامت تک کی اپنے لیے مہلت لے لی کہ تو سہی جو تمام انسانوں کو گمراہ کر کے دم لوں اور دکھا دوں کہ یہ اس عزت کا حقدار نہیں ہے جو اسے دی گئی۔ خالق نے بھی اپنی بات بالا ہونے کے ثبوت اور اُس کی حجت کو ختم کرنے کے لیے، اُسے مہلت دیدی، کہ تو لاکھ کوشش کرے، پھر بھی انسانوں میں میرے کچھ سچے اور اچھے بندے ایسے رہیں گے۔ جو کسی طرح تیرے ورغلانے میں نہ آئیں گے۔ اور حق اور نیکی کے راستے سے نہ ہٹیں گے۔

اب جو انسان گمراہی میں پڑتے اور فساد کے مرتکب ہوتے ہیں، وہ اپنی بساط بھر، شیطان کی بات پوری کرنے میں حصہ لیکر اُس کے مددگار بنتے ہیں، اور جو نیکی اور خدا پرستی کے راستے پر قائم رہتے ہیں، وہ اپنے خدا کی بات کو برقرار رکھتے اور اُس کے مددگار قرار پاتے ہیں۔

آدم ہی کے پیکر کی بچی ہوئی مٹی سے صنف اناث کی پہلی فرد حوا کی پیدائش ہوئی، انہیں خالق نے آدم کا شریک زندگی قرار دیا، اور ان دونوں کو کچھ مدت کے لیے، جب تک اُسے منظور ہوتا، اپنے ایک مخصوص

باغ پر بہار میں ، رہنے کا حکم دیا ، مگر اس وقت انھیں ، ایک خاص درخت کے قریب جانے سے روک دیا ، یہ کہہ کر کہ اگر اس درخت کے پاس گئے تو فوراً اس جنت سے باہر کر دیئے جاؤ گے ۔

شیطان کہ جسے آدم کی بلندی اور عزت کی بنا پر ، اُن سے پرخاش پیدا ہو ہی گئی تھی حضرت حوّا کے ذریعہ سے آدمؑ کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ اس درخت کے قریب گئے بغیر اگر اس میں سے چکھ لیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے ۔ احتیاط کی رو سے ، بہتر ان کے لیے یہی تھا کہ وہ کم از کم اس بارے میں رب العزت سے اجازت حاصل کر لیتے ، مگر اُنھوں نے اس بارے میں تساہل سے کام لے کر بیوی کے مشورے ہی پر عمل کر لیا ، جس کا محرک در اصل بر بنائے عداوت ابلیس ہوا تھا ۔

اس درخت سے کھانا تھا کہ جنت کے لباس اُن کے جسم سے اتر گئے اور خالق کے حکم سے فوراً اُن کو اس جنت سے نکل کر اس دنیا میں آنے کا حکم ہو گیا ، جہاں ایک وقت میں تو انھیں آنا ہی تھا ، اس لیے کہ وہ اسی زمین کی خلافت کے لیے تو پیدا ہی کیے گئے تھے ۔ اب انھیں اپنے کیے کا پچھتاوا بہت ہوا ، اور انھوں نے خالق کی بارگاہ میں بڑی توبہ و انابت کی ، جسے بالآخر اللہ نے قبول کیا ، مگر بہر حال اب انھیں اس دنیا میں آنا لازم تھا ، جسے اب ان کی اولاد ہی سے آباد ہونا تھا ۔ چنانچہ وہ اُترے اور اب ان کے اولاد ہونا شروع ہوئی جس میں

اللہ نے بڑی کثرت و برکت عطا فرمائی، کیونکہ ان ہی سے اس پوری زمین کی بستی بسانا تھی۔

خدا نے آدمؑ کو نظام زندگی میں دخل رکھنے والی ہر ضروری چیز کا علم دے کر بھیجا تھا، ایسا جو زندگی بسر کرنے کے لیے کافی ہو سکے۔ اور پھر وہ ان کے ذریعہ سے ان کی اولاد تک پہنچے تو اسی علم کے سہارے سے وہ انسانی فکر و نظر کے ساتھ باقی مجہول اشیاء تک پہنچکر اپنی اختیاری ترقی کے درجوں کو طے کر سکیں۔ مگر اب بڑا مسئلہ نسل آدمؑ کے آگے بڑھنے کے لیے ان کی اولاد کی شادی کا تھا، کیونکہ نوع انسانی میں سگے بھائی بہنوں کی شادی کی سنت کا جاری ہونا صحیح نہ تھا۔ اس مشکل کو حل کرنے میں جنت کی حوروں اور بنی جان کی باقی ماندہ نیک فردوں سے کام لیا گیا، اور اس طرح نسل انسانی آگے بڑھی۔

آدمؑ کے یوں تو بہت سے بیٹے تھے، مگر ایک فرزند شیثؑ اپنے باپ کے کمالات کے حامل تھے۔ یہی ان کے جانشین قرار پائے۔ اس کے علاوہ ان کے دوسرے بیٹوں میں دو بھائی قابیلؑ و ہابیلؑ تھے۔ یہ دونوں بھائی صفات و کردار میں مختلف تھے۔ ہابیل نیکوکار تھے اور قابیل نافرجام۔ ایک تو طبیعتوں کا اختلاف، پھر ہابیل کی نیکی کا نتیجہ یہ تھا کہ باپ کی نظر عنایت ان پر زیادہ تھی۔ یہ قابیل کے لیے ہابیل سے پرخاش کا سبب تھا۔ اس پر طرّہ یہ ہوا کہ

دونوں نے بارگاہِ الٰہی میں قربانیاں پیش کیں۔ اُس زمانہ میں جس کی قربانی قبول ہوتی تھی، ایک آگ آسمان سے اُتر کر اُس قربانی کو جلا دیتی تھی۔ اس آگ نے ہابیل کی قربانی کو آکر جلا دیا اور قابیل کی قربانی خالص نیت سے نہ تھی۔ اُس کو چھوڑ دیا۔ اب قابیل نے طے کر لیا کہ ہابیل کی زندگی کا خاتمہ کر دیگا، اور اُن سے بھی کہہ دیا کہ میں تمھیں زندہ نہ چھوڑوں گا۔ ہابیل نے کہا کہ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ قربانی کی قبولیت خلوص و پاکیزگی کردار سے وابستہ ہوتی ہے رہا گیا یہ کہ تم مجھکو قتل کرنا چاہتے ہو تو اچھا تمھیں اختیار ہے، مگر میرا ہاتھ تمھارے قتل کے لیے کبھی نہیں اُٹھ سکتا۔ آخر قابیل نے ہابیل کو قتل کر ڈالا۔ یہ پہلا خون تھا جو نوعِ انسانی میں زمین پر بہایا گیا۔

شیثؑ کی اولاد پھولی پھلی اور دنیا میں پھیلی۔ ان میں برائیوں کے دور کرنے اور اچھائیوں کو رواج دینے کے لیے برابر ہادیان و معلمین آتے رہے، جنھیں انبیا و مرسلینؑ کہتے ہیں۔ اور جنھوں نے لاتعداد مشکلوں کا مقابلہ کر کے نوعِ انسانی کو بلندی کی منزل تک پہنچانے میں ہر امکانی کوشش صرف کی۔

نظری و عملی اعتبار سے جس ضابطۂ حیات کی تبلیغ یہ انبیاءؑ کرتے رہے، وہی دین اور شریعت ہے۔ جس کے اصول ہمیشہ یکساں رہے اور وہی غیر تبدل اصول حقیقتاً دینِ اسلام ہیں۔

تاریخ اسلام اور اُس کا آغاز

انّ الدّین عند اللہ الاسلام اس آیت قرآن کی روشنی سے جو حقیقت ظاہر ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ دینِ الٰہی ہمیشہ سے اسلام ہے جتنے انبیاؑ و مرسلینؑ آئے وہ اسلام ہی کی تبلیغ کے لیے —— آدمؑ جو پیغام لائے وہ بھی اسلام ہی تھا اور نوحؑ نے جس تعلیم کو پہنچایا وہ بھی اسلام ہی تھی، اور اسی طرح جتنے انبیاؑ و مرسلین مبعوث ہوئے، وہ سب اسلام ہی کے مبلغ تھے —— اس لحاظ سے آدمؑ، نوحؑ اور تمام انبیاء کی سرگزشتِ زندگی سب تاریخ اسلام کا جُز ہے —— مگر مذاق تاریخی حقیقتوں کی گہرائی میں اس باریک بینی کا متحمل نہیں ہے۔ وہ حقیقت جس کا نام اسلام ہے، بے شک ہمیشہ سے تھی مگر وہ اصطلاحی طور پر اسلام کے نام سے موسوم نہ تھی۔ —— قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی اصطلاح کا آغاز حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کے وقت سے ہوا۔ سب سے پہلے یہی بزرگوار تھے، جنھوں نے اس دین کے پیرووں کا نام مُسلم رکھا، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے ھو سمّٰکم المسلمین من قبل (حج آیت ۷۸)۔ اور سب سے پہلے اس لقب سے موسوم ہونے والے یہی حضرت ابراہیمؑ اور اُن کے فرزند اسمٰعیلؑ تھے، اور انھوں نے اپنی اولاد کے لیے اس کے باقی رکھنے کی بارگاہ الٰہی میں دعا کی۔

دعا کی:- واذ یرفع ابراهیم القواعد من البیت واسمٰعیل ربنا تقبّل منا انّك انت السمیع العلیم ربنا واجعلنا مسلمین لك ومن ذرّیتنا اُمة مسلمة لك وارنا مناسکنا وتب علینا انك انت التواب الرحیم (بقرہ آیت ۱۲۷-۱۲۸)

اس سے یہ ظاہر ہے کہ اولادِ ابراہیمؑ جو سلسلۂ نسل اسمٰعیل سے اس کے بعد ہوئی، ان میں سے جو دین صحیح کے پابند ہوں، وہ دین اسلام ہی کے پیرو سمجھے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ یہی ان کے مورث اعلیٰ کا دین تھا، جس کے بقا کی انھوں نے اپنی اور اسمٰعیل کی مشترک نسل (ذرّیتنا) میں دعا کی تھی۔ لہذا درمیان میں سلسلہ نسل اسحٰق میں یہودیت اور عیسائیت کے دین جو رائج ہوئے وہ بنی اسرائیل سے مختص تھے —— اولادِ اسمٰعیل کے لیے نہ تھے۔

اولادِ اسمٰعیل کے لیے جو دین تھا، وہ وہی دین ابراہیمی تھا جو ملّتِ حنیفیّہ اور اسلام سے موسوم تھا اور جو بنصّ قران یہودیت، نصرانیت اور شرک سب کا مقابل تھا۔

ماکان ابراهیم یهودیا ولا نصرانیا ولکن کان حنیفا مسلما وما کان من المشرکین۔ (آل عمران آیت ۶۷)

ابراہیم خلیل اللہ اور ان کے اسلامی کارنامے

جناب ابراہیمؑ بحیثیت مسلم اول سب سے پہلی فرد ہیں، جس نے کھل کر شرک کے خلاف علم احتجاج بلند کیا —— اُس وقت شرک کی

تین قسمیں رائج تھیں۔ اول اجرام علویہ۔ یعنی ستاروں، چاند اور آفتاب کی پرستش ــــ حضرت ابراہیم نے حکیمانہ انداز بیان میں ان اجرام کو خدا سمجھنے سے اختلاف کیا فلمّا جنّ علیہ اللیل رأ ی کوکبا "رات کو تاریکی چھائی تو ایک ستارہ نظر آیا" قالَ ھٰذا رَبِّیْ" کہا یہ میرا پروردگار ہے! اگر پہلے ہی آغاز کلام مخالفت سے کرتے تو مخاطب گروہ ابتدا ہی سے روگردان ہوجاتا، آگے سننے کے لیے تیار ہی نہ ہوتا۔ لہٰذا طریقۂ گفتگو یہ اختیار کیا کہ پہلے جیسے ان کی ہمنوائی کر رہے ہیں۔ اس طرح اُن کو حقیقت طلبی کی راہ میں اپنا رفیق سفر بنالیا۔

فلمّا افل قال لا احبّ الآفلین

جب وہ غروب کرگیا تو کہا "میں غروب ہونے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یعنی خدا وہ ہونا چاہیئے، جسے زوال و فنا نہ ہو۔ یہ ایک معیار تھا جو آخر تک حقیقت شناسی کے لیے کافی تھا، مگر مخاطب گروہ کے ذہن نشین بنانے کے لیے اسی معیار پر اُن کے ہر ہر معبود کو لاکر دکھلا دینا تھا کہ وہ قابل پرستش نہیں ہے۔ فلما رأی القمر بازغا قال ھذا ربی فلمّا افل قال لئن لم یھدنی ربّی لاکونن من القوم الضآلین "جب چاند کو چمکتے دیکھا" کہا اچھا تو یہ میرا رب ہوگا ــــ جب وہ بھی غروب کرگیا تو کہا" اگر میرا رب میری رہنمائی نہ کرے تو میں بھی گمراہوں میں ہوجاؤں۔

ان لفظوں سے ظاہر کر دیا کہ وہ اپنے ذہن میں اپنے ایک رب کی معرفت لیے ہوئے ہیں، جو ان تمام معبودوں کے علاوہ ہے۔

اب آفتاب کی باری آئی۔

فلما رأی الشمس بازغۃ قال ھذا ربی ھذا اکبر فلما
افلت قال یا قوم انی بریٔ مما تشرکون انی وجھت وجھی
للذی فطر السمٰوٰت والارض حنیفا وما انا من المشرکین۔

“جب سورج کو چمکتے دیکھا تو کہا اچھا یہ میرا پروردگار ہے۔ یہ تو زیادہ بڑا ہے۔ جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا اے میری قوم والو میں ان سب چیزوں سے جنھیں تم شریک کرتے ہو بری ہوں —— میں نے اپنا رخ کیا ہے صرف اس کی طرف، جو آسمان و زمین کا خالق ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔”

اب سفر ختم ہو گیا اور منزل حقیقت تک رسائی ہو گئی —— ثابت ہو گیا کہ یہ چیزیں، جن کی پرستش کی جا رہی ہے، قابل عبادت نہیں ہیں۔

دوسری قسم کا شرک جو رائج تھا وہ اصنام پرستی کی صورت میں تھا۔ یعنی پتھر وغیرہ کے بت اپنے ہاتھ سے تراش کر پھر ان کی عبادت کی جاتی تھی۔ یہ وہ واضح شرک ہے، جس کے مرتکب گروہ کا اصطلاحی نام ہی مشرکین ہو گیا ہے —— اور یہ شرک اس وقت تک دنیا میں موجود ہے —— اس کے خلاف ابراہیم کو اپنے آس پاس ہی

جہاد شروع کرنا پڑا ـــــ ان کے متصل حلقہ کا ایک اتنا قریبی اُن کا بزرگ، جسے وہ خود بھی باپ کہہ کر پکارتے تھے، اور قرآن مجید بھی باپ کی لفظ سے یاد کرتا ہے، خود بت تراشی کا پیشہ اختیار کیے ہوئے، بت پرستی کا علمبردار تھا۔

جناب ابراہیم نے پہلے ملائمت سے سمجھایا کہ

یا ابت لم تعبد ما لا یسمع ولا یبصر ولا یغنی عنك شیئا۔

جب اُس پر کوئی اثر نہ ہوا تو آخر انداز بیان میں تلخی پیدا ہوئی۔

اتتخذ اصناما الهة انی اراك و قومك فی ضلال مبین

جب اس پر بھی اثر نہ ہوا تو پوری جماعت کے دل پر ایک عملی چوٹ لگا کر انھیں ان اصنام کی بے حقیقتی پر متنبہ کرنے کی کوشش کی۔ اور یہ موقع اُس وقت نکالا کہ جب وہ سب اپنی عیدگاہ میں کسی مشرکانہ رسم کے ادا کرنے کے لیے جا رہے تھے ـــــ ابراہیم کو بھی لے جانا چاہا۔ انھوں نے ناسازی مزاج کا عذر کر کے جانے سے انکار کر دیا اور جب وہ لوگ چلے گئے تو انھوں نے تمام بتوں کو توڑ کر اُن کے پرخچے اُڑا دیئے۔ فجعلهم جذاذا

بس ایک بت کو چھوڑ دیا جو سب میں بڑا تھا۔

الا كبيرا لهم لعلهم يرجعون۔

جب وہ لوگ واپس ہوئے تو تلاطم پڑ گیا اور شور مچا

من فعل هذا بالهتنا۔

قالوا سمعنا فتی یذکرھم یقال لہ ابراھیم

"یہ ہمارے خداؤں سے کس نے سلوک کیا"

کچھ لوگوں نے کہا کہ ایک جوان کو ہم نے سنا ہے کہ وہ اکثر ان کو برا کہتا رہتا ہے۔ اس کا نام ابراہیم ہے، ہو نہ ہو وہی کا ہوگا ابراہیمؑ بلائے گئے۔ پوچھا گیا

ءانت فعلت ھذا بالھتنا یا ابراھیم

کیا تم نے ہمارے خداؤں سے یہ سلوک کیا ہے؟ کہا۔

بل فعلہ کبیرھم ھذا فاسئلوھم ان کانوا ینطقون

"میں ایسا کیوں کرتا، اس بڑے بت نے ایسا کیا ہوگا، خود ان سے پوچھو نہ، اگر یہ بولتے ہوں"

یہ ایک لطیف پیرایہ میں ان بتوں کی بے بسی، عاجزی اور پھر ان کے خدا سمجھے جانے کی رکاکت کا اظہار تھا۔ حقیقت واضح تھی استدلال کا ان کے پاس جواب نہ تھا۔ مگر اپنے خداؤں کے مسمار ہونے پر غضب کا غصہ تھا، اس لئے ابراہیمؑ کی جان لینے پر آمادہ ہوگئے جس کی تفصیل عنقریب آئے گی۔

تیسری قسم انسان پرستی، وہ اس طرح تھی کہ بادشاہ وقت نمرود اپنی خدائی کا اعلان کرتا تھا۔ ابراہیمؑ نے اس شرک کے خلاف بھی اعلان کیا اور اس سے بحث کی۔ جب اس نے پوچھا تم اپنا پروردگار

کسے سمجھتے ہو۔ جواب دیا

ربی الذی یحیی ویمیت

میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے

قال انا احیی وامیت

اُس نے لفظ کے مفہوم کو مجاز پر ڈھال کر کہا۔

میں بھی مارتا جلاتا ہوں اس طرح کہ کسی بے گناہ کی جان لے لی اور ایک ایسے شخص کی جس کے لیے سزائے موت کا حکم ہو چکا تھا جاں بخشی کر دی۔

ابراہیمؑ نے کہا۔

فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فات بھا من المغرب

اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تم مغرب سے نکال دو“

فبہت الذی کفر

وہ کافر مبہوت اور لاجواب ہو گیا۔ مگر اس کے نتیجہ میں غیظ و غضب اُس کا ابراہیم کے خلاف بہت بڑھ گیا۔

ان تمام توحید رب کی تبلیغوں اور شرک کے خلاف ہدایتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ طے کر لیا گیا کہ ابراہیمؑ کو آگ میں جلا دیا جائے۔ جس کا ذکر قرآن میں ایک جگہ اس طرح ہے۔

قالوا حرّقوہ وانصروا الھتکم ان کنتم فاعلین

انھوں نے کہا بس ابراہیمؑ کو آگ میں جلا دو اور اپنے خداؤں

گی مدد کرو اگر کرنا چاہتے ہو۔

دوسری جگہ اس طرح ہے

قالوا ابنوا لہ بنیانا فالقوہ فی الجحیم

"انھوں نے کہا کہ ایک احاطہ اُن کے لیے بنا کر اس میں آگ بھڑکا دو اور اُنھیں اس آگ میں ڈال دو"

روایتوں میں آگ کی کیفیت بتائی گئی ہے کہ ایک مہینہ تک باہتمام تمام لکڑیاں جمع ہوئیں اور پھر ان میں آگ دی گئی اور مشتعل کیا گیا۔ شعلوں کی بلندی وہ تھی کہ طائر ہوا میں پرواز نہ کر سکتا تھا۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ کوئی شخص جا کر ابراہیمؑ کو اس آگ میں ڈال نہ سکتا تھا۔ اس لیے منجنیق تیار کیا گیا اور منجنیق میں ابراہیمؑ کو غل و زنجیر میں مقید کر کے بٹھایا گیا اور پھر آگ میں پھینک دیا گیا۔

ابھی تک حکمت الٰہی نے یہ سب کچھ ہونے دیا، اور اُس کی قدرت کسی منزل پر بھی سدّراہ نہ ہوئی۔ اس لیے کہ ابھی انسانی عمل آخری منزل تک نہ پہونچا تھا۔ اگر قدرت الٰہی مزاحم ہو جاتی تو نہ ظالموں کے ظلم کی آخری حد سامنے آتی اور نہ صابر کے صبر کی۔ ظالموں کو کہنے کا موقع تھا کہ ہم جلا تھوڑے ہی دیتے، ہم تو فقط دھمکا رہے تھے۔ اور مظلوم کی نسبت غلط فہمی رہ جاتی کہ آخر تو انسان کا دل رکھتے تھے، کسی وقت تو متزلزل ہو ہی جاتے۔ لیکن انسانی اختیا

کی منزل ختم ہوگئی اُس وقت جب جسد ابراہیمی منجنیق سے جدا ہوا اب ظالمین خود بھی اگر چاہتے کہ ابراہیمؑ جلنے سے محفوظ رہ جائیں تو ممکن نہ تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو کچھ کر سکتے تھے اب سب کچھ کر چکے تھے اور ابراہیمؑ کے لیے بھی اب کوئی صورت نہ تھی کہ وہ طالب اماں ہو کر یا اپنے طرز عمل کی تبدیلی کا اعلان کر کے اپنی جان بچا سکتے۔ بس جہاں سے انسان کی طاقت ختم ہوئی وہاں سے خالق کی قدرت شروع ہوئی۔ ارادۂ باری متعلق ہوا کہ یا نار کونی برداً وسلاماً علی ابراہیم۔ مطلب یہ تھا کہ آگ نقطۂ اعتدال برودت پر آئے، جو کسی صورت سے مزاج انسانی کے لیے مضرت رساں نہ ہو۔

یہ خلیلؑ حق کی اپنی ذات سے قربانی تھی جو اسلام کی راہ میں سب سے پہلے پیش ہوئی اور اس میں خود ابراہیمؑ کی طرف سے ذرّہ بھر بھی کمی نہیں رہی۔ یہ اور بات ہے کہ ابھی خالق حکیم کے کچھ اہم مقاصد ذات ابراہیمؑ سے وابستہ تھے، اس لیے اُس نے خود اپنے مقاصد کی خاطر آخر میں ابراہیمؑ کی حفاظت کا سامان کر دیا اس لیے شہادت واقع نہیں ہوئی۔

اس مشاہدۂ قدرت اور تجلّی حقانیت کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ تمام قوم ایمان اختیار کر لیتی، مگر ان کے کفر و عناد میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور اتمام حجت کی منزلیں ختم ہو چکی تھیں، اس لیے

داعی اسلام نے ہجرت کا ارادہ کرلیا، تاکہ اب زمین خدا کے دوسرے حصوں کو دعوتِ حق سے روشناس بنائیں۔ صرف دو فردیں تھیں بحیثیت مومن جو جناب ابراہیمؑ کے ساتھ تھیں۔ ایک اُن کی زوجہ مکرمہ سارۂ اور دوسرے اُن کے حقیقی بھتیجے لوطؑ۔ جن کا ذکر قرآن اس طرح کرتا ہے فآمن لہ لوط وقال انی مھاجر الی ربی سیھدین۔ یہ تینوں تاریخ اسلام کے پہلے مہاجر ہیں جو سرزمین بابل (عراق) سے نکل کر شام کی طرف روانہ ہوئے۔ دو چار مقاموں کی ردّ و بدل کے بعد جناب ابراہیمؑ فلسطین میں مقیم ہوئے، اور لوطؑ کو مقام اردن پر تبلیغ حق کے لیے بھیجدیا۔ یہاں ان کو ایک نہایت بداعمال اور سرکش قوم سے سابقہ پڑا، جو نفسانی خواہشوں کی تکمیل میں بڑے شرمناک کاموں کا ارتکاب کرتی تھی۔

لوطؑ نے ان کی ہدایت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا، مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا وہ قرآن کی لفظوں میں یہ ہے۔

فما کان جواب قومہ الا ان قالوا اخرجوا آل لوط
من قریتکم انھم اناس یتطھرون

"قوم کی طرف سے ان کے تعلیمات وہدایات کا جواب صرف یہ ملا کہ اُنھوں نے آپس میں کہا کہ لوط اور اُن کے پورے خاندان کو اپنے گاؤں سے باہر نکال دو، یہ ایسے لوگ ہیں جو ہمارے گناہوں میں ہمارے ساتھ شرکت نہیں کرتے اور پاک دامانی کے

علمبردار رہیں۔

یہ ہیں اسلامی تاریخ کے ابتدائی نقوش جو مصائب تکالیف ایذا رسانیوں اور غربت و جلاوطنی کے واقعات کو اپنا سرمایہ بنائے ہوئے ہیں۔

جب ہی تو پیغمبر اسلام ؐ نے فرمایا تھا بدأ الاسلام غریبا "اسلام کا آغاز ہی غربت اور بے وطنی سے ہوا ہے" پھر بھلا مسلمانوں کو کب زیبا ہے کہ وہ حوادث و مصائب اور شدائد و ابتلا سے پریشان ہوں اور ہمت ہار دیں۔ انھیں تو ان چیزوں کو اپنے خصائص قومی میں سمجھ کر ان کے برداشت کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیئے۔

جب حکمت باری نے قوم لوط میں قطعی اصلاح کی گنجائش نہ پائی تو اُن پر عذاب نازل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس موقع پر اسلام کے داعی اول کا یہ کردار قابل ملاحظہ ہے کہ باوجودیکہ اس کے پہلے متعدد بار انبیاء و مرسلین مسلسل نافرمانی اور سرکشی کی بنا پر امت کے لیے عذاب کی دعا کرتے رہے تھے مگر رہنمائے اسلام کی یہ خصوصیت شروع سے رہی کہ وہ خلق خدا کی ایذا رسانی اور مسلسل سرتابی کے باوجود ان کے لیے بددعا کے واسطے تیار نہیں ہوتا، بلکہ خالق سے اُن کی سفارش کرتا ہے چنانچہ جب فرشتے قوم لوطؑ پر عذاب نازل کرنے کے لیے آئے

اور راستے میں جناب ابراہیمؑ سے آکر ملے اور اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو ابراہیمؑ نے قوم لوطؑ پر عذاب نازل کیے جانے کے خلاف بارگاہ الٰہی میں اصرار کے ساتھ مسلسل عرضداشت پیش کی جسے قرآن میں خالق نے ان الفاظ سے تعبیر کیا ہے کہ

یجادلنا فی قوم لوط

"ابراہیمؑ ہم سے قوم لوط کے بارے میں لڑتے رہے"

یہ تعبیر حضرت رب العزت کی جانب سے حضرت ابراہیمؑ کی اُس حیثیت کے پیش نظر ہے جو انھیں خلیل کے لقب کی صورت میں عطا کی گئی تھی۔ یقیناً ابراہیمؑ اپنے اس اصرار کو اگر بیان کرتے تو اُسے التجا، درخواست، دعا، مناجات وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کرتے مگر خداوند تعالیٰ نے اُن کو جو دوست کا لقب دے دیا تھا تو ان کی ان عرضداشتوں کو دوستانہ بے تکلفی کے انداز میں اس لفظ سے یاد کیا کہ وہ ہم سے لڑنے لگے۔ یہ لڑائی اور جھگڑا خالق کے تقاضائے رحمانیت و ربوبیت کے بالکل مطابق تھا۔ اس سے یہ وہ ابراہیمؑ کے لیے کوئی نقص نہیں بلکہ رفعت نظر اور وسعت حوصلہ کا ثبوت تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس خاص محل پر حکمت الٰہی کا مقتضا یہی تھا کہ ابراہیمؑ کی اس عرضداشت کو قبول نہیں کیا گیا اور قوم لوط پر عذاب نازل ہی کر دیا گیا۔ بس لوط اور اُن کے گھر کے آدمی بچ گئے، لیکن اُن کی زوجہ جو ایمان و عمل کے جوہر سے خالی

تھی اُن سے الگ کر دی گئی اور عذاب الٰہی سے دوچار ہوئی۔

ان فی ذلک لعبرۃ لاولی الالباب

دوسرا باب

آل ابراہیمؑ سرزمین حجاز میں

ولادت اسمٰعیلؑ اور ہجرت ہاجرہؑ

شام میں آئے ہوئے حضرت ابراہیمؑ کو مدت گذر گئی۔ ابراہیمؑ اور اُن کی بیوی سارہؑ دونوں کی عمر زیادہ ہو چکی ہے مگر نعمت اولاد سے محروم ہیں۔ انتہائی مایوسی کے بعد جناب سارہ نے حضرت ابراہیمؑ سے خود کہا کہ وہ ہاجرہ سے جو اُن کے پاس خدمت کے لیے رکھی گئی تھیں تعلقات ازدواجی قائم کریں کہ شاید اُن سے خداوند عالم اولاد عطا فرمائے

حضرت ابراہیمؑ نے اُن کی فرمائش پر عمل کیا۔ چنانچہ جناب ہاجرہ کے یہاں اسمٰعیلؑ کی ولادت ہوئی جس سے حضرت ابراہیمؑ کی مزید توجہ کا جناب ہاجرہ کی طرف مبذول ہو جانا فطری تھا۔ اب جناب سارہ کو ہاجرہ کا قیام اپنے پاس ناگوار ہونے لگا اور خلیل حقؑ سے فرمائش کی کہ آپ

ان ماں بیٹے کو میرے پاس سے ہٹا دیں اور کہیں دور لے جا کر رکھ دیں حکمت باری سبحانہ اس پردہ میں ایک بڑی امت، ایک بڑے ملک، بلکہ تمام عالمین کے لیے ایک مرکز کی تشکیل کا مرقع دیکھ رہی تھی اس لیے اُس نے اپنے خلیل کو مامور کر دیا کہ وہ سارہ کے اصرار کی تعمیل کریں اور ہاجرہ اور اُن کے فرزند کو ملک شام سے باہر لے جائیں

کہاں ارض فلسطین اور کہاں مکہ کی سرزمین، مگر اُسی رہنمائے مطلق کی رہنمائی ہیں، جو خلیلؑ کو یہاں تک لے آئی، ایک ایسی جگہ جہاں نہ پاس کوئی چشمہ، نہ کوئی سبزہ، نہ زراعت، اپنے اللہ پر بھروسہ رکھنے والی پاک بی بی کو اُس کے شیر خوار معصوم کے ساتھ بغیر کسی ظاہری سہارے کے بٹھا دیا اور خود سرزمین شام کی طرف واپس تشریف لے گئے۔

وہ بے آب و گیاہ میدان اور اُس میں ایک خاتون محترمہ اور ایک بے زبان بچّہ۔ تھوڑے ہی وقت کے بعد بچّہ پر پیاس کا غلبہ ہوا۔ ہاجرہ نے تلاش آب میں صفا و مروہ کے درمیان سات چکّر کیے، جس کی یادگار مناسک حج میں صفا و مروہ کے درمیان سعی کی شکل میں ہمیشہ کے لیے قائم ہے۔ آخر بقدرت خدا اُسی زمین سے چاہ زمزم نمودار ہوا۔ "ہر کجا چشمہ بود شیریں" بس پانی کا برآمد ہونا تھا کہ چاروں طرف سے طیور جمع ہوئے اور طیور کی رہنمائی سے

انسانوں کا گذر ہوا۔ یہ دنیائے اسلام کے مرکز کا سنگ بنیاد تھا جس کی تاریخ کے اجزا میں بے سرو سامانی، غربت اور ہجرت بھوک اور پیاس، سب ہی چیزیں نمایاں طور پر نظر آ رہی تھیں اور یہی شدت و صعوبت آئندہ کی فراخی و خوشحالی کی تمہید قرار پائی

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا

بیٹے کی قربانی

ابراہیمؑ کی ایک قربانی جو بہت اہم تھی، وہ بیٹے کی قربانی تھی۔ اہل کتاب یہود و نصاریٰ مدعی ہیں کہ وہ فرزند اسحٰقؑ تھے۔ مگر قرآن مجید سے جو ظاہر ہوتا ہے اور بائیبل کے سیاق سے بھی اُس کی تائید ہوتی ہے یہ ہے کہ وہ جناب اسمٰعیلؑ تھے و روایت بھی اس کی تائید میں ہے اس لیے کہ اگر یہ واقعہ جناب اسحٰقؑ سے متعلق ہوتا تو اس کی یادگاریں بنی اسرائیل اور ملک شام میں نظر آتیں، کیونکہ اسحٰق بنی اسرائیل کے مورث اعلیٰ تھے اور شام میں اُن کا مسکن تھا۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ اس کی یادگاریں، اُن کے مذہبی روایات اور رسوم دینی میں بالکل پائی نہیں جاتیں اور نہ ملک شام میں اس کے آثار نظر آتے ہیں۔

برخلاف اس کے اولاد اسمٰعیلؑ میں اُس کی یادگاریں قائم ہوئیں جو قبل اسلام بھی جاری تھیں اور بعد اسلام بھی برقرار رہیں جو

عید الاضحیٰ اور مناسک حج سے ظاہر ہیں۔ نیز اس یادگار کا مرکز سرزمین مکہ ہوئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کا تعلق اسمٰعیلؑ سے تھا۔ اسحٰقؑ سے نہیں تھا،

اب واقعہ کی تفصیل ملاحظہ ہو جو بائبل میں بھی شرح و بسط کے ساتھ موجود ہے، اور قرآن مجید نے بھی اُسے درج کیا ہے، اور یہ اُس کی اہمیت ہے کہ آگ میں ابراہیمؑ کے پھینکے جانے کا اشارہ قرآن نے صرف چند جملوں میں کیا ہے لیکن ذبح فرزند کے واقعہ کو چند مسلسل آیتوں میں کافی توضیح کے ساتھ درج کیا ہے اس طرح کہ

فلما بلغ معه السعی قال یا بنی انی اری فی المنام انی اذبحك فانظر ماذا تری۔

"جب اسمٰعیلؑ اس حد تک پہونچے کہ باپ کے ساتھ اُن کی جدوجہد میں شرکت کرنے لگے"

یہاں پر تقاضائے اختصار نے درمیان کی منزلیں بعد کے کلام سے پتہ چل جانے کی وجہ سے ترک کرا دی ہیں۔ ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے فرزند کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر رہے ہیں۔ حکم الفاظ سے نہ تھا جن سے فوری ہونے کا اندازہ ہو اس لیے ابراہیمؑ نے اس دن اس بارے میں کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔ دوسری رات پھر خواب دیکھا۔ یہ دن بھی گذر گیا۔ تیسری رات پھر بعینہ وہی خواب دیکھا۔ اب تو ابراہیمؑ نے محسوس کیا کہ حکم کی تعمیل فوری منظور ہے۔

لہذا وہ تعمیل پر تیار ہو گئے، لیکن اگر وہ اسمٰعیلؑ سے کوئی تذکرہ نہ کرتے تو قربانی حضرت ابراہیم کا عملی کارنامہ تو ہوتی۔۔ اسمٰعیل کو کوئی خاص درجہ حاصل نہ ہوتا۔

ابراہیمؑ نے چاہا کہ اُن کا فرزند مقام قربانی میں خود اختیاری بلندی کا حامل ہو جائے، اس لیے اپنے بیٹے کو بلا کر کہا (یہاں سے صراحۃً قرآن میں ذکر ہے) "بیٹا! میں خواب میں دیکھ رہا ہوں" اس لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کئی مرتبہ خواب دیکھ چکے تھے اگر ایک دفعہ دیکھا ہوتا تو رأیت کہا جاتا کہ میں نے خواب دیکھا ہے۔ یہ نہ کہتے کہ "دیکھ رہا ہوں" "کہ میں تمھیں ذبح کر رہا ہوں۔" اب تم ذرا غور کرو کہ تمھاری کیا رائے ہے۔"

یہ امتحان الٰہی تھا کہ اتنا شدید حکم، بیٹے کو ذبح کرنا اور ذریعۂ حکم بہ ظاہر اتنا سبک، یعنی خواب۔ یہ ہو سکتا تھا کہ مَلک بھیجا جائے اور وہ آکر بصورت پیام الٰہی حکم پہنچائے۔ مگر یہ ہوتا تو اس کے حکم ہونے میں کوئی پہلو تامل کا پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ خالق نے چاہا کہ ذریعہ ایسا اختیار کرے جسے ناقص نفوس خواب کہہ کر ٹال سکتے ہیں۔ اس طرح ابراہیمؑ کی بلندی نفس نمایاں ہو کہ انھوں نے منشائے الٰہی بتلانے والے خواب کو کتنی اہمیت دی اور یہ صرف انبیاء کا کام ہو سکتا ہے کیونکہ خواب اُن کے لیے ایک طریقہ وحی کی حیثیت رکھتا ہے اور اس لیے بجز نبی کسی معمولی آدمی کو اس قسم کے خواب پر عمل

جائز نہیں ہے

پھر ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے سے یہی کہا کہ انی اریٰ فی المنام انی اذبحک۔ یہ نہیں کہتے کہ مجھے حکم ہوا ہے کیونکہ حکم کہہ دینے کے بعد آخر کا ٹکڑا کہ "غور کرو تمہاری کیا رائے ہے" بے جوڑ ہو جاتا۔ پھر یہ جناب اسمٰعیلؑ کا بھی امتحان تھا کہ وہ باپ کے خواب کو کیا سمجھتے ہیں۔ اسی لیے جہاں تک امتحان کے سوالات کا پرچہ تھا، خواب رہا۔ اللہ نے خواب دکھایا اور ابراہیمؑ نے بھی خواب ہی کی لفظ کے ساتھ اسمٰعیلؑ سے بیان کیا۔ مگر جہاں سے جواب شروع ہوتا ہے وہاں سے لفظ بدل جاتی ہے۔ اسمٰعیلؑ نے یہ نہیں کہا کہ جو خواب دیکھا ہے اُسے پورا کیجیے، بلکہ کہا۔

یا ابت افعل ما تؤمر ستجدنی ان شاء اللہ من الصّابرین

"اے بابا، جو حکم ہوا ہے اُس کی تعمیل کیجیے۔ اللہ نے چاہا تو مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیے گا۔"

اب حضرت ابراہیمؑ نے امتثال حکم الٰہی کا انتظام کیا۔ اسمٰعیلؑ کو میدان منیٰ میں لائے۔ ذبح کے لیے بالکل تیار ہوئے۔ فرزند کو سامنے لٹایا اور چھری گلے پر رکھ دی۔ اس کے بعد کیا ہوا، اس کا تذکرہ قرآنی لفظوں میں یوں ہے:-

فلمّا اسلما وتلّہ للجبین ونادیناہ ان یا ابراھیم قد صدّقت الرؤیا انا کذلک نجزی المحسنین اِنّ ھٰذا

لھو البلاء المبین وفدیناہ بذبح عظیم

"جب دونوں باپ بیٹے قربانی کے لیے تیار ہو گئے اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا۔"

یہاں یہ امر خاص طریقہ پر قابل توجہ ہے کہ قربانی کے لیے عملی طور سے آمادہ ہو جانے کو قرآن نے لفظ اسلما سے تعبیر کیا ہے۔ کہ وہ "مسلم ہو گئے"۔ اس طرح ذہن مسلم پر یہ اثر ڈالا ہے کہ قربانی پر آمادگی ایک مسلم کی نمایاں عملی شان ہے، جس میں واضح طور پر اُس کا اسلامی جوہر آشکار ہوتا ہے۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ عام طور پر سمجھا اور کہا جاتا ہے کہ خالق نے قربانی کا حکم برطرف کر دیا۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ حکم کا تعلق افعال اختیاری سے ہوتا ہے اور ذبح میں جہاں تک کہ اختیاری افعال کا تعلق ہے وہ سب منزلیں ابراہیمؑ نے طے کر لی تھیں پھر اب حکم برطرف کیے جانے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟ اس کے علاوہ یہاں حکم کسی خطاب لفظی کے ذریعہ سے تو تھا نہیں۔ حکم بذریعۂ خواب تھا خواب کو دیکھنا چاہیے کہ کیا تھا؟

اگر خواب میں جناب ابراہیمؑ نے یہ دیکھا ہوتا کہ میں بیٹے کو ذبح کر چکا ہوں تو سمجھا جا سکتا تھا کہ اس کی تعمیل میں کوئی جزو باقی رہ گیا مگر انھوں نے خواب میں دیکھا تھا کہ بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں جو دیکھا تھا وہ پورا عمل میں آ گیا۔ پھر حکم برطرف کیے جانے کا خیال کہاں تک درست

ہوسکتا ہے پھر سب سے زیادہ فیصلہ کن دلیل یہ ہے کہ خالق کریم کی ندا جو قرآن میں اس کے بعد درج ہے، اُسے دیکھا جائے: خالق کی ندا یہ نہیں آئی کہ بس بس اے ابراہیم ہم نے اپنا حکم منسوخ کیا۔ برطرف کر دیا۔ بلکہ بنص قرآن آواز یہ آئی کہ یا ابراھیم قد صدّقت الرؤیا

"اے ابراہیم تم نے خواب سچ کر دکھایا،،

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حکم بلا امتثال برطرف نہیں ہوا، بلکہ جتنا حکم تھا، اُس کی پوری پوری تعمیل ہو گئی، جس کی سند خالق نے اپنی اس ندا کے ساتھ دے دی۔

انا کذٰلک نجزی المحسنین

"یوں ہی ہم جزا دیتے ہیں حسن عمل رکھنے والوں کو،،

یہ ایک اصول عام کا اعلان ہے کہ ہمارا پورا نظام مجازات و قربانیوں ہی سے وابستہ ہے۔ اور بلند مقاصد کی تکمیل اور رضائے الٰہی کی خاطر جس حد تک قربانی کی جائے گی اُس حد تک جزا کا استحقاق ہوگا۔ ان ھٰذا لھو البلاء المبین" یقیناً یہ کھلی ہوئی آزمائش تھی، وفدیناہ بذبح عظیم۔

یہ حقیقت ہے کہ تمام اوامر و نواہی اور پورا نظام تشریع نوع انسانی سے قربانیوں کے مطالبہ پر مشتمل ہے اور انبیاء، مرسلین یا ائمۂ دین، ان سب کے تقرر کا مقصد کلی، قربانی کی اعلیٰ مثالیں پیش کرنا ہے۔ اگر قربانی اسمٰعیل، پیش خدا قربانی کا سب سے اعلیٰ نمونہ

ہوتی تو اس قربانی کو ملتوی کرنے اور فدیہ بھیجے جانے کی کوئی ضرورت نہ تھی مگر چونکہ علم الٰہی میں ایک مکمل ترین قربانی اسی نسل اسمٰعیلؑ میں وجود میں آنے والی تھی، اور آج کی قربانی اگر مختتم طور پر ہو جاتی تو اُس نسل ہی کا وجود نہ ہو سکتا جو قربانیوں کی مکمل تاریخ اپنے عمل سے مرتب کرنے والی تھی۔ اس لیے خالق کو اُس "ذبح عظیم" کی وجہ سے اسمٰعیلؑ کی قربانی کو فدیہ بھیج کر ملتوی کرنا ہی مصلحت معلوم ہوا، مگر اس سے خود ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کے کارنامہ کی اہمیت میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوتی؛ اس لیے کہ وہ اپنے عمل کی تمام منزلیں جو اُن کے ارادہ و نیت سے متعلق تھیں طے کر چکے تھے اور ان میں ایک ذرّہ بھی کمی نہیں ہوئی

تعمیر کعبہ

جب اسمٰعیلؑ بڑے ہو گئے تو خالق کی طرف سے ابراہیمؑ مامور ہوئے کہ وہ اور اسمٰعیلؑ دونوں مل کر خانۂ کعبہ کی تعمیر کریں اور یہ بنص قرآن پہلا گھر تھا جو کسی شخص مخلوق کی طرف منسوب ہوتے ہوئے نہیں بلکہ خالق کی طرف منسوب ہوتے ہوئے تمام خلق کے لیے بنایا گیا۔

ان اول بیت وضع الناس للذی ببکۃ مبارکا وھدی للعالمین"

"بیت" کو ہدایت عالمین کہنا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ اس بیت والے (اھل البیت) کچھ ہوں گے جو تمام عالمین کے لیے رحمت و ہدایت کا

ذریعہ ہوں گے، جن کی فردِ اکمل کے لیے خطاب ہو گا ’’وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین۔

یہ خانۂ کعبہ کی تعمیر درحقیقت اُس دین اسلامی کے ایک مرکز کی تعمیر تھی جو تمام عالمین کے لیے سرمایۂ فلاح و نجات ہے۔ دونوں باپ بیٹے انتہائی خلوص کے ساتھ اس کی تعمیر میں مصروف ہوئے اس طرح کہ حضرت خلیل اللہؑ معماری کر رہے تھے اور اسمٰعیلؑ مزدوری کر رہے تھے، حالانکہ مکہ میں قبیلہ جرہم آ کے بس چکا تھا اور قبیلہ کی آبادی کے بعد ظاہر ہے کہ معماروں اور مزدوروں کی بھی کمی نہ تھی مگر خالق کو یہی منظور تھا کہ اس کا گھر خلیل اور ان کے فرزند کے پاک ہاتھوں سے بنے، اور اس طرح ہمیشہ کے واسطے فرزندانِ اسلام کے لیے اس تصور کی داغ بیل ڈال دی کہ محنت مزدوری کوئی عیب نہیں ہے، جب کہ ہمارے دینی و روحانی مورثِ اعلیٰ خود اس کام کے لیے خالق کی طرف سے برسرِکار لائے گئے۔

یہی وہ موقع تھا جب حضرت ابراہیمؑ اپنے فرزند کی شرکت میں دیواریں اونچی کرتے جاتے تھے اور اپنی ذرّیت کے لیے اسلام پر قائم و برقرار رہنے کی دعا کرتے جاتے تھے۔

واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمعیل ربّنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک وارنا مناسکنا وتب علینا

انک انت التواب الرحیم،

حج کا اعلان

جب خانۂ کعبہ تعمیر ہو چکا تو خطاب الٰہی جناب ابراہیم کی طرف متوجہ ہوا کہ

اذن فی الناس بالحج یاتوک رجالا وعلی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق۔

اب تم عامۂ خلائق میں خانۂ کعبہ کے حج کا اعلان کر دو، دیکھنا کہ اس اعلان کے ہوتے ہی وہ تمھاری طرف دوڑ پڑیں گے، خواہ پیادہ اور خواہ سوار، بڑے بڑے دور افتادہ اور ناہموار مقامات سے۔ یہ بھی دعائے ابراہیمؑ کی قبولیت کی تمہید تھی، جب کہ انھوں نے اپنی بیوی ہاجرہ اور صغیر فرزند اسمٰعیل کو یہاں لا کر رکھا تھا تو اسی وقت عرض کیا تھا۔

انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم وارزقھم من الثمرات لعلھم یذکرون۔

خدا نے دلوں کو اس طرف موڑنے کا یہ سامان کیا کہ اس جگہ کو مرکز حج بنا دیا اور کسی حکم شرعی میں خالق نے یہ ذمہ داری نہیں لی کہ خلق خدا اس پر عمل بھی کرے گی مگر اس دعوت حج میں کچھ ایسی تاثیر

قرار دی کہ تمام عرب خواہ وہ مومن ہوں یا کافر، اس آواز سے متأثر ہو گئے۔ یہاں تک کہ جب حضرت محمد مصطفےٰؐ دعوت اسلام کے ساتھ مبعوث ہوئے، تو اس وقت عرب نماز، روزہ اور زکوٰۃ تمام فرائض دینیہ سے بیگانہ تھے، مگر حج کی رسم اس وقت بھی پورے جاہ و جلال کے ساتھ قائم تھی۔ اگرچہ اُنھوں نے اس میں غیر مستحسن اجزا بھی داخل کر دیے تھے، مگر خانۂ کعبہ کی مرکزیت کا احساس اُن میں قائم تھا، اور یہ اُس غیر معمولی تصرف روحانی کا اثر تھا جسے دعوت ابراہیمی میں خالق نے مضمر کر دیا، اور یہی اس اسلامی مرکز کے بقاء و دوام کی ہمیشہ کے لیے ضمانت ہے۔

تیسرا باب

اولادِ ابراہیمؑ کی دو شاخیں

جناب ابراہیمؑ علیہ السلام کی اولاد دو شاخوں پر تقسیم ہوئی ایک بنی اسرائیلؑ اور دوسرے بنی اسمٰعیل۔ بنی اسرائیلؑ جناب سارہ کے بطن سے پیدا ہونے والے فرزند جناب اسحٰقؑ کی اولاد ہیں۔ اسحٰقؑ کے فرزند یعقوبؑ کا لقب اسرائیلؑ تھا، اس لیے یہ نسل اُن کی طرف منسوب ہونے سے بنی اسرائیل ہوئی اور بنی اسمٰعیلؑ ہاجرہ کے بطن سے پیدا ہونے والے فرزند جناب اسمٰعیلؑ کی اولاد تھے، جو حجاز کی

سرزمین پر پھلے پھولے اور اسلام کی مرکزیت کے اصلی حامل قرار پائے۔

بنی اسرائیلؑ اور اسلام

اپنی ذرّیت سے اُمّت مسلمہ کے ہونے کی دعا تو جناب ابراہیمؑ نے اسمٰعیلؑ کی شرکت میں کی تھی، مگر چونکہ "مسلم" ہونے میں خود آپ مرکزی حیثیت رکھتے تھے، اس لیے آپ کی اولاد میں، خواہ وہ نسل اسحٰقؑ سے ہو، جب تک کوئی دوسرا اولوالعزم صاحب شریعت وکتاب نبی جس کی طرف دین کی نسبت ہو، مبعوث نہیں ہوا، جتنے اسوقت تک افراد دیندار ہوئے وہ دینِ اسلام ہی کے پیرو تھے۔ اس لیے جناب ابراہیمؑ سے جناب موسٰیؑ تک جتنے نبی ہوئے وہ سب اسلام ہی کے مبلّغ تھے ہاں جب موسٰیؑ اور عیسٰیؑ مبعوث ہوئے تو اگرچہ اصول دین میں وہ بھی کچھ مختلف نہ تھے، مگر چونکہ نظام شریعت اُن کا دوسرا تھا اس لیے اُن کی طرف منسوب ہوکر دین موسوی اور دین عیسوی اسلام کا مقابل ہوگیا۔ یعنی اب براہ راست جو ملت ابراہیمیہ کے پیرو تھے، وہ مسلم تھے اور جو موسیٰ یا پھر عیسیٰ کے ماننے والے ہوئے وہ یہودی یا عیسائی ہوئے

حضرت ابراہیمؑ اور موسٰیؑ کے درمیان جو اہم شخصیتیں ہوئی ہیں وہ ابراہیمؑ کے فرزند اسحٰقؑ اور اسحٰقؑ کے فرزند یعقوبؑ اور یعقوب کے فرزند یوسفؑ ہیں، اِن سب کے کارنامہ ہائے حیات تاریخ اسلامی کا جز ہیں اور قرآن نے کھُلّم کھُلّا اُن کے مُسلم ہونے کا اعلان کیا ہے۔

ام کنتم شہداءَ اذ حضر یعقوب الموت اذ قال لبنیہ ما تعبدون من بعدی قالوا نعبد الٰہک والٰہ آبائک ابراھیم واسحٰق الٰہا واحدا ونحن لہ مسلمون۔

اس سے ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل بھی ابتدا میں دین اسلام ہی کے پیرو تھے اور اسی لیے قرآن نے بار بار انھیں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ حضرت محمد مصطفےٰؐ کوئی نیا دین لے کر نہیں آئے ہیں بلکہ یہ وہی ہے جو تمھارے بزرگ مرتبہ آباؤ اجداد کا دین تھا۔

اسحٰقؑ

جناب اسحٰقؑ کے متعلق قرآن کریم میں کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں ہے جو اسلامی تاریخ کا جزو بن سکے۔ توریت میں آپ کے بعض واقعات مذکور ہیں اور ”اسرائیلیات“ کے تحت میں بعض اسلامی کتب تاریخ و سیر میں بھی اُن کی صدائے بازگشت آگئی ہے مگر وہ عقل و نقل، ہر معیار سے ناقابل قبول ہیں۔ اگر ایک قول کے مطابق اسحٰقؑ کو ذبیح مان لیا جائے تو بے شک ان کی ذات سے متعلق واقعہ کا اسلامی تاریخ سے بہت بڑا تعلق ہو جائے گا، مگر یہ پہلے ہی بیان ہو چکا ہے کہ ذبیح اللہ حضرت اسمٰعیلؑ ہیں، اسحٰق نہیں ہیں۔

یعقوبؑ اور یوسفؑ

ان دونوں باپ اور بیٹے کی روداد زندگی قرآن کریم میں

احسن القصص کہہ کے پیش کی گئی ہے۔ اس کے خصوصی اجزا یہ ہیں۔ یوسفؑ کا خواب۔ بھائیوں کا حسد۔ یوسفؑ کو بھائیوں کا سیر و سیاحت کے بہانے لے کر جانا اور کنوئیں میں پھینک دینا۔ باپ کے پاس آکر یہ دروغ بیانی کہ یوسفؑ کو بھیڑیئے نے کھا لیا۔ یعقوبؑ کا مسلسل گریہ جس سے آنکھیں سفید ہو گئیں۔ برادران یوسفؑ کا گریۂ یعقوبؑ پر بجائے ہمدردی کے طعن و تشنیع کرنا اور اُن کے رونے سے ناگواری کا اظہار کرنا۔ ایک قافلہ والوں کا یوسفؑ کو کنوئیں سے باہر نکال کر مصر لیجانا۔ نبی خدا کا بطور غلام فروخت کیا جانا۔ عزیز مصر کے محل میں زوجۂ عزیز کی طرف سے پیغمبر کا شدید آزمایش میں مبتلا ہونا، اور اس میں اُن کا آخر تک ثابت قدم رہنا۔ بے جرمی کے جرم میں یوسفؑ کا قید خانہ میں ڈال دیا جانا۔ بعد میں یوسفؑ کا تخت حکومت پر پہنچنا۔ بھائیوں کا قحط سالی کی وجہ سے محتاج ہو کر آنا اور یوسفؑ کا ان کو اپنی شخصیت کے ظاہر کیے بغیر عطا و احسان سے سرفراز کرنا۔ پھر اس کے بعد آخری سفر میں اُن کا یوسفؑ کی شخصیت پر مطلع ہونا اور اپنے سابق کردار پر پشیمان ہو کر معذرت خواہ ہونا، اور یوسفؑ کا وسعت حوصلہ سے کام لیتے ہوئے اُن کو بکشادہ پیشانی معاف کر دینا۔ واقعہ کی یہ تمام کڑیاں قرآن مجید میں بالتفصیل اپنی شان اعجاز کے ساتھ مذکور ہیں، جسے ہر شخص قرآن کریم یا اُس کے ترجمہ میں

دیکھ سکتا ہے۔

اس کو یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ ایک خاندان کا آپس کا جھگڑا ہے، اس لیے اس کو تاریخ اسلام سے کیا تعلق۔ حقیقت امر تو یہ ہے کہ وہ چاہے ہابیل و قابیل کی باہمی نزاع ہو اور چاہے برادران یوسفؑ کا اختلاف۔ ہمیشہ نزاع و اختلاف کی بنیاد عقائد و اوصاف ہی کے اختلاف پر ہوتی ہے۔ اگر دو بھائی صفات و خیالات میں متحد ہیں تو اُن میں اختلاف پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ جب تصادم ہوگا تو اچھے اور بُرے میں، حق اور باطل میں، صحیح اور غلط میں ہوگا۔

برادرانِ یوسفؑ اگر مسلک میں یوسفؑ سے متحد ہوتے تو کبھی وہ ان کے ساتھ دشمنی پر آمادہ نہ ہوتے۔ قرآن کریم نے جو مختلف اُن کے اقوال و اعمال ذکر کیے ہیں اُن سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ایمان و اطاعت کے جوہر سے بالکل خالی تھے۔ مثلاً اپنے والد بزرگوار جناب یعقوبؑ کے متعلق ان کا یہ کہنا لیوسف و اخوہ احبّ الی ابینا ونحن عصبۃ ان ابانا لفی ضلال مبین۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ جناب یعقوبؑ کی نبوّت پر قطعاً ایمان نہ رکھتے تھے۔ یا اُن کا یعقوبؑ کے گریہ و بکا پر معترض ہوتے ہوئے یہ کہنا تاللہ تفتأ تذکر یوسف حتی تکون حرضا او تکون من الہالکین۔

اس میں ایک نفسیاتی حقیقت یہ بھی کارفرما ہے کہ ظالم کبھی

تذکرۂ مظلوم کو پسند نہیں کرتا، اور یہ معیار ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کسی مظلوم کی یاد پر معترض وہی ہوگا جو اُس پر مظالم کا ذمہ دار ہو، یا اُس کے ظالموں کے ساتھ ذہنی حیثیت سے مشارکت رکھتا ہو۔

اس واقعہ کا قرآن مجید میں اس تفصیل سے بیان ہونا ہی اس کی دلیل ہے کہ اسے تاریخ اسلام سے کوئی اہم تعلق ہے اور یہ حقیقت ہے کہ تاریخ اسلام اور مسلمانوں کی ذہنیت کی تعمیر میں ان واقعات کا بڑا دخل ہے۔ ایک ایسی قوم کو مصائب اور مشکلات سے گھبرانا چاہیے جس کی تاریخ اپنے آغاز میں عیش و آرام اور قوت و اقتدار سے معمور ہو۔ لیکن تاریخ اسلام کا مرقع تو آغاز ہی سے، اشکوں کی تری، خون دل کی رنگینی اور غل و زنجیر کے نقش و نگار سے آراستہ ہے۔ پھر بھی انہی مشکلات میں آسانیاں اور انہی ناکامیوں سے کامیابیاں پیدا ہوئیں۔ پھر آج اور کسی وقت بھی مسلمانوں کو مشکلات و تکالیف سے تو گھبرانا نہ چاہیے۔ پھر سب سے آخر میں یوسفؑ کے عمل کی یہ بلندی کہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد کس طرح اپنے بھائیوں کو معاف کر دیتے ہیں اور فرماتے ہیں لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللّٰہ لکم وَھو ارحمُ الراحمین

یہ وہ کردار کی رفعت ہے جسے ارتقائے اسلامی کی انتہائی منزل میں حضرت محمد مصطفےٰؐ نے دُہرایا، اور یوسفؑ کے بلندی کردار کی قدر شناسی تھی کہ وہ فقرہ زبان پر جاری فرماتے ہوئے جناب یوسفؑ کا

حوالہ دیا۔

فتح مکہ میں جب آپ کی مخالف قریش کی جماعت اُن تمام مظالم کے بعد جو وہ ہجرت کے پہلے اور بعد کر چکی تھی آپ کے سامنے بے بس کھڑی ہوئی تھی، تو آپ نے وہی یوسفؑ کا فقرہ زبان پر جاری فرماتے ہوئے اُن کو صاف دلی کے ساتھ معاف فرما دیا تھا اور کہا تھا کہ میں تم سے وہ کہتا ہوں، جو میرے بھائی یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا۔ آج بھی اسلام کا مطالبہ اپنے نام لیواؤں سے یہی ہے کہ اُنھیں جہاں اقتدار حاصل ہو اپنی مخالف اقلیت کے ساتھ ایسے ہی فیاضانہ برتاؤ سے کام لیں، اور یہی انسانیت کا مطالبہ ہے، ہر اُس جماعت سے جو کسی نقطۂ ارض پر اقتدار کی حامل ہو جائے اور اس کے خیالات سے مختلف گروہ بے بسی کی حالت میں اُس کے قبضہ و اقتدار میں آگیا ہو،

نسل اسمٰعیلؑ

جناب ہاجرہ اور اُن کے فرزند اسمٰعیلؑ جب زمینِ مکہ پر لائے گئے ہیں تو یہاں آبادی کا نام و نشان نہ تھا مگر جب چاہ زمزم نمودار ہوا تو اب طیور نے ادھر کا رُخ کیا، اور طیور سے انسانوں کو یہاں کے پانی کے وجود کا علم ہوا، اسی زمانہ میں قبیلۂ جرہم کا ادھر سے گذر ہوا

تاریخ، عرب کے تین طبقے بتاتی ہے، پہلا طبقہ جو یمن کی نسل یعرب بن قحطان سے تھا عرب عاربہ کہلایا۔ ان میں قبائل عاد و ثمود۔ طسم و جدیس اور جرہم اولیٰ تھے، ان کا کفر و عصیان بہت بڑھا تو عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے اور اسی لیے ان کو قبائل بائدہ "نیست و نابود شدہ قبیلے" کہا جاتا ہے۔ دوسرا طبقہ عرب متعربہ یہ وہ تھے جو عرب عاربہ سے ازدواجی رشتوں کے ساتھ منسلک ہوئے اور پھر ان کی اولاد میں عربی زبان نے نشو و نما پائی۔ یہ قبیلہ جرہم جو سرزمین مکّہ پر آ کے آباد ہوا انہی قبائل میں سے تھا اس کو جرہم ثانیہ کہا جاتا ہے۔ اسمٰعیلؑ نے اس قبیلہ میں نشو و نما پائی، اس لیے یہ بڑھے تو عربی زبان بولتے ہوئے۔ پھر ان کی شادی بھی اسی قبیلہ میں ہوئی۔ اس لیے اولاد کی مادری زبان عربی ہوئی۔ اور اب یہ قوم عرب کا تیسرا طبقہ ہوا جو عرب مستعربہ کہلایا۔ خالق کا کرنا یہ کہ عرب کا نام اور اس کا وقار دنیا میں قیامت تک لیے انہی عرب مستعربہ سے قائم رہا۔

عرب عاربہ تو پہلے ہی فنا ہو چکے تھے۔ عرب متعربہ کی نسلیں اب تک ممکن ہے کہ صحرائی قبائل میں موجود ہوں، لیکن تاریخ میں بہرحال ان کا نام و نشان کوئی نہیں ہے۔ ہاں جو تمام عالم میں قوم عرب کے عزت و افتخار کے علمبردار رہیں، وہ آلِ اسمٰعیلؑ ہی ہیں جو تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ خدا کا وعدہ تھا جو اس نے

ابراہیمؑ سے نسل اسمٰعیلؑ کے بارے میں کہا تھا کہ میں اس کی نسل میں برکت دوں گا، اور اس میں بارہ سردار قرار دوں گا۔ اس وعدہ کا ذکر توریت سفر تکوین باب ۱۷ میں ان الفاظ میں ہے

"اور اسمٰعیلؑ، میں نے اس کے حق میں تیری بات سنی۔ دیکھ اب میں اسے برکت دوں گا اور اس کو بارآور کروں گا اور بہت افزائش دوں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اس کو بڑی قوم بناؤں گا۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نسل اسمٰعیل کے خاص افراد کے لیے سردار کی اصطلاح اسی وقت قرار پائی جو سادات آل رسولؐ کے لیے اب تک قائم ہے۔ اسمٰعیلؑ کے بیٹوں میں قیدار کی نسل بہت پھلی پھولی اور حجاز میں آباد ہوئی۔ یہی پیغمبر اسلامؐ کے مورث اعلیٰ ہیں۔

عدنان

جناب رسول خداؐ کا نسب عدنان تک معتبر تواریخ اور کتب انساب میں متفقہ حیثیت سے درج ہے۔ عدنان کی شخصیت اولاد اسمٰعیلؑ میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی تھی اور جس طرح عرب عاربہ آل قحطان ہونے پر مفتخر تھے، اسی طرح بعد میں آنے والی اسمٰعیلی نسل آل عدنان ہونے پر نازاں تھی۔

رسول ؐ کا نسب عدنان سے اسمٰعیل تک اگرچہ بہت سی کتابوں میں درج ہے، مگر ایک حدیث بھی اس کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ حضرت نے فرمایا اذا بلغ نسبی عدنان فامسکو، یعنی میرے شجرہ نسب کو عدنان تک پہونچا کر خاموش ہو جایا کرو"

اس کا مطلب یہ لیا گیا ہے کہ عدنان سے اسمٰعیل تک کا جو شجرہ بیان کیا جاتا ہے، اس کی حضرت نے تصدیق نہیں فرمائی۔ لیکن خود حضرت ؐ نے اس کے مقابل میں جو صحیح شجرہ تھا اُسے بیان بھی نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ علم الانساب کی اہمیت کو گھٹانے کی ایک شکل ہو۔ اور بہت ممکن ہے کہ اس حدیث کا یہ مطلب ہی جو سمجھا گیا ہے صحیح نہ ہو، بلکہ اس سے مراد وہ ہو جو ابن اسحٰق کے الفاظ سے مستفاد ہوتا ہے اُنھوں نے کہا ہے

من عدنان تفرقت القبائل من ولد اسمٰعیل بن ابراھیم علیہما السلام (سیرۃ ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۵)

اس کا مطلب یہ ہے کہ عدنان سے اسمٰعیل تک تمام اولاد اسمٰعیل کا شجرہ متحد ہے۔ ممکن ہے کہ اس درمیان میں جو مختلف شاخیں پیدا ہوئی ہوں، وہ کچھ دُور بڑھ کر ختم ہو گئی ہوں، اور جو نسل باقی رہی وہ ہر طبقہ میں ایک ہی شاخ سے وابستہ ہو۔ اور ممکن ہے کہ بعض طبقوں میں بس ایک ہی شخص پیدا ہوا ہو یا ایک ہی

شخص سے نسل چلی ہو۔ لیکن عدنان وہ ہیں جن کی اولاد سے مختلف قبیلے ہوئے۔ اس صورت میں حدیث رسولؐ سے مراد یہ ہو گی کہ میرے خصوصی شجرہ میں جب عدنان تک پہونچ جاؤ تو آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کے بعد میرا شجرہ وہی ہے جو تمام آل اسمعیلؑ کا ہے۔

معد

عدنان کے دو فرزند تھے معد اور عک۔ عک کی شادی یمن کے اشعری قبیلہ میں ہوئی اس لیے ان کی اولاد یمن میں پھیلی معد کی اولاد حجاز میں رہی اور پیغمبرؐ اسلام ان ہی کی نسل میں تھے جنگ صفین میں نسل عک کے قبائل معاویہ کے ساتھ تھے اور انھوں نے جناب امیرؑ کی فوج کے مقابلہ میں جان توڑ کر مقابلہ کیا تھا۔

نزار

معد کے چار فرزند تھے۔ نزار۔ قضاعہ۔ قنص۔ ایاد۔ ان کی اولاد میں چار قبیلے ہوئے۔ جن میں سے قضاعہ اور ایاد کے قبیلوں کے افراد کے نام عرصہ تک تاریخ میں مل جاتے ہیں قنص کے قبیلہ کا پتہ کچھ زیادہ دن تک نہیں چلتا۔ نزار کو ان سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی اور آل نزار عرب میں ممتاز درجہ رکھتے معلوم ہوتے ہیں۔

مضر

نزار کے تین فرزند ہوئے۔ مضر۔ ربیعہ۔ انمار۔ پہلی دونوں نسلیں ربیعہ اور مضر ملک عرب میں بڑی اہمیت کی حامل ہوئیں قبیلہ انمار کی دو شاخیں خشعم اور بجیلہ ہوئیں، جن کی طرف منسوب افراد کے نام تاریخ میں عرصہ تک نظر آتے رہے ہیں۔

الیاس

مضر کی نسل دو بیٹوں سے پھیلی ایک الیاس اور دوسرے عیلان

مدرکہ

الیاس کے تین فرزند ہوئے، مدرکہ۔ طانجہ اور قمعہ۔ مدرکہ کا اصلی نام عامر تھا، مگر چھینے میں اونٹوں کو بھگا کر لے جانے والے ایک لٹیرے گروہ کے کامیاب تعاقب کی وجہ سے ان کا لقب مدرکہ ہو گیا

خزیمہ

مدرکہ کے دو فرزند خزیمہ اور ہذیل ہوئے جن سے دو بڑے قبیلے عالم وجود میں آئے۔

کنانہ

خزیمہ کی اولاد کنانہ۔ اسد۔ اسدہ اور ہون تھے پہلے

دو کی نسل دو قبیلوں کی شکل میں تاریخ میں نمایاں درجہ رکھتی ہے آخری دو کی نسل کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔

نضر

کنانہ کے فرزند چار ہوئے۔ نضر۔ مالک۔ عبد مناۃ اور ملکان ان میں بھی دو کی نسل مشہور ہے۔ آخری دو گمنام ہیں۔

مالک

نضر کے دو فرزند مالک اور مخلد تھے، مالک بنی ہاشم کے اجداد میں سے ہیں۔ دوسرے فرزند کی نسل بظاہر ختم ہو گئی۔

فہر

مالک کے صرف ایک بیٹے فہر تھے جو مشہور و معروف ہیں۔

نسل قریش کی ابتدا

یہ نسل قریش کے نام کے ساتھ کس وقت سے ملقب ہوئی۔ اس میں علمائے تواریخ و انساب میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ قریش نضر بن کنانہ کا لقب تھا جو فہر بن مالک کے جدامجد تھے اور ان ہی کی اولاد قریش کہلاتی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ فہر بن مالک کا لقب

ہے اور آپ کی اولاد قریش ہے۔ ان کے پہلے یہ نسل کنانی کہلاتی تھی وجہ تسمیہ میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ تقرّش سے ماخوذ ہے جس کے معنی اکتساب کے ہیں اور چونکہ ان کو تجارت میں انہماک تھا، اس لئے قریش کہلائے اور دوسرا قول یہ ہے کہ تقرش کے معنی اجتماع کے ہیں اور چونکہ ان کے ذریعہ سے تمام قوم کی شیرازہ بندی ہوئی اس لیے قریش کہا گیا۔ بہر حال اس لقب میں نسل قریش کے کردار کی تعمیر کے واسطے ایک اچھی روایت مضمر ہے خواہ یہ کہ وہ کبھی بے کاری کی زندگی کو شعار نہ بنائیں اور کسب معاش میں دوا دوش کو کسر شان نہ سمجھیں اور خواہ یہ کہ انھیں تفرقہ بندیوں سے پرہیز کرنا چاہیے اور حتی الامکان اتحاد و اتفاق کے راستے کا سالک رہنا چاہیئے۔

غالب

قہر کے چار بیٹے تھے۔ غالب۔ محارب۔ حارث اور اسد

لوی

غالب کے دو فرزند لوی اور تیم ہوئے جن سے دو قبیلوں کی بنیاد قائم ہوئی اور دونوں تاریخ میں مشہور رہیں۔ لوی کے چار فرزند ہوئے۔ کعب، عامر، سامہ اور عوف۔ یہ چار قبیلوں کے مورث اعلیٰ ہوئے۔

مرّہ

کعب کے تین بیٹے۔ مرّہ۔ عدی اور ہصیص ہوئے۔ ان میں سے پہلے دو کی اولاد میں دو قبیلے تاریخ میں معروف ہیں۔ تیسرے کی نسل کا پتہ نہیں ملتا۔

کلاب

مرّہ کے بھی تین بیٹے تھے۔ کلاب تیم اور یقظہ۔ پہلے دو قبیلے مشہور اور تیسرے کی اولاد غیر معلوم ہے۔

قصی

کلاب کے دو بیٹے تھے۔ قصی اور زہرہ۔ ان میں سے اول الذکر بڑے بالغ نظر، حکیمانہ فکر کے مالک اور مدبّر تھے۔ انھوں نے اپنی اولاد کو شراب خواری سے پرہیز کرنے کی وصیت کی تھی اور کہا تھا۔

یا بنیّ ایاکم وشرب الخمر فانہا ان صلحت الابدان افسدت الاذہان والادیان (امالی صدوق)

"یعنی اے میرے بچو شراب خواری سے ہمیشہ پرہیز کرنا اس لیے کہ یہ اگر جسم کو کچھ فائدہ پہونچائے تو عقلی قویٰ اور دینی احساسات کو تو یقیناً تباہ کرنے والی ہے۔"

علمی اور اصلاحی کارنامہ اُن کا یہ ہے کہ قبیلۂ قریش کے افراد کو جو دور دور منتشر ہو گئے تھے اُنھوں نے یکجا کر کے خانۂ کعبہ کے گرد سکونت اختیار کرنے پر آمادہ کیا اور تنظیم قومی کی کامیاب ترین سعی انجام دی۔ اسی لیے اُن کا لقب مجمّع ہوا۔ خانۂ کعبہ کی تولیت جو عرصہ سے اولادِ اسمٰعیل کے ہاتھ سے نکل گئی تھی، قصی کے ہاتھ میں واپس آئی اور تمام معزز عہدے جو قوم پر اقتدار کا ذریعہ ہیں اُن کے لیے مجتمع ہوئے۔

فکان قصی اول بنی کعب بن مالک اصاب ملکا اطاع له به قومه فکانت الیه الحجابة والسقایة والرفادة والندوة واللواء فحاز شرف مکة کله (ابن ہشام)

اُن کا فرمان قوم میں ایک مذہبی قانون کی طرح واجب العمل سمجھا جاتا تھا (وکان امره فی قومه من قریش فی حیوته ومن بعد موته کالدّین المتبع لا یعمل بغیره)

عبدمناف

قصی کے چار فرزند تھے، عبد مناف۔ عبد الدار۔ عبد العزیٰ اور عبد، جن میں سے پہلے دو کی نسل دنیائے تاریخ سے روشناس ہوئی خصوصیت کے ساتھ عبد مناف کو خود اپنے والد بزرگوار کی حیات میں ممتاز عزت اور شہرت حاصل ہوئی کان عبد مناف قد شرف فی زمان ابیه وذهب کل مذهب (ابن ہشام)

عبد مناف کا اصلی نام مغیرہ تھا (سیرت ابن ہشام) عبد مناف لقب ممکن ہے، ددھیال یا ننھیال کے دوسرے رشتہ داروں نے رکھ دیا ہو اور اُسے شہرت نے دی ہو۔ اس لیے آباؤ اجداد رسولؐ کے موحدؑ ہونے کے خلاف اُسے بطور ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔

(حدیقۂ سلطانیہ ج ۲ صفحہ ۱۴۰)

ہاشم

عبد مناف کے چار فرزند تھے۔ ہاشم۔ عبد شمس۔ مطلب اور نوفل۔ ان میں سے ہاشم اپنے والد بزرگوار کے صحیح جانشین اور مکہ معظمہ کے منصبی اعزازات کے حامل تھے۔ ان کی فیاضی اور مہمان نوازی بھی شہرۂ آفاق تھی اور اُن کا لقب ہاشم بھی زمانہ قحط سالی میں تمام قریش کو کھانا کھلانے کی وجہ سے ہوا چنانچہ ایک شاعر نے کہا ہے۔

عمرو الذی ہشم الثرید لقومہ
قوم بمکۃ مسنتون عجاف

(ابن ہشام جلد ا صفحہ ۸۵)

عبد شمس کی اولاد میں بنی اُمیہ ہوئے۔ مطلب اور نوفل کی نسل زیادہ دور تک چلتے معلوم نہیں ہوتی۔

عبد المطلب

جناب ہاشم کے چار بیٹے تھے۔ عبد المطلب، اسد، ابو صیفی اور نضلہ

ان میں سب سے زیادہ مشہور عبدالمطلب ہوئے۔ اُن کا اصلی نام "شیبہ" تھا، "عبدالمطلب" لقب کی نسبت اُن کے چچا مطلب کی طرف ہے جو ان کے والد بزرگوار ہاشم کے بعد اُن کے منصبی اعزازات کے حامل ہوئے تھے۔ یہ مطلب بڑے سخی اور فیاض تھے، یہاں تک کہ قریش میں فیض ہی کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے،

اس انتساب کی وجہ یہ ہے کہ جناب ہاشم اپنی زندگی کے اواخر میں مدینہ گئے تھے تو وہاں قبیلۂ بنی عدی میں نجار کی ایک خاتون سے عقد کیا اور وہیں شیبہ کی ولادت ہوئی۔ جناب ہاشم انھیں ننھیال میں چھوڑ کر مکہ واپس گئے اور وہاں انتقال فرمایا۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کے بھائی مطلب اپنے بھتیجے کو لانے کے لیے مدینہ گئے مگر ننھیال والوں نے بھیجنے سے انکار کیا۔ صرف والدہ نے بچہ کو جانے کی اجازت دے دی اور جناب مطلب بھتیجے کو اونٹ پر اپنے پیچھے بٹھا کر مکہ لائے۔ راستے والوں میں ناواقف اشخاص میں سے جس نے بھی دیکھا، یہ سمجھا کہ مطلب کوئی غلام خرید کر لائے ہیں اور اس کا چرچا عبدالمطلب کی لفظ سے کرنے لگے۔ اس طرح یہی لفظ مشہور ہو گئی۔ مطلب کی وفات کے بعد عبدالمطلب اپنے خاندانی اعزازات کے حامل ہوئے اور آپ کو وہ اقتدار اور مرتبہ حاصل ہوا جو آپ کے آباؤ اجداد کو بھی دنیوی حیثیت سے حاصل نہ ہوا تھا

وشرف فی قومہ شرفا لم یبلغہ احد من اٰبائہ

واحبہ قومہ وعظم خطرہ فیھم

(سیرۃ ابن ہشام ج ا صفحہ ۸۷)

قدرت کی طرف سے بھی آپ کو مرجعیت و شہرت بڑھانے کے سامان ہوتے گئے، چنانچہ چاہ زمزم جو عرصہ سے روپوش ہو گیا تھا، آپ ہی کے ہاتھوں ظاہر ہوا۔ نیز بہت سے تبرکات جو مدت سے غائب ہو گئے تھے، دوبارہ دستیاب ہوئے۔ آپ نے حاجیوں کی سقایت کے لیے خاص انتظامات کیے جس کی وجہ سے "ساقی الحجیج" کے الفاظ سے یاد کیے جانے لگے، جیسا کہ حذیفہ بن غانم شاعر نے کہا ہے

وساقی الحجیج ثم للخبز ہاشم
وعبد مناف ذلک السید الفہری

(ابن ہشام صفحہ ۹۴)

چوتھا باب

واقعۂ فیل اور اُس کے اسباب

جناب عبدالمطلب کے دور کا ایک بڑا نمایاں واقعہ واقعۂ فیل کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی اجمالی تفصیل یوں ہے کہ تبع بادشاہ یمن کو کچھ مفسدوں نے خانۂ کعبہ کا حال بتایا کہ وہاں بڑا زر و جواہر چڑھایا جاتا ہے لہذا اُس پر حملہ کیجئے تو بہت دولت ہاتھ آئے گی۔ اُس نے اپنے ساتھ کے راہبوں سے پوچھا تو اُنھوں نے خانۂ کعبہ کے مذہبی احترام و تقدس کا تذکرہ کیا اور کہا کہ وہ ہمارے مورث اعلیٰ حضرت ابراہیم کا بنایا ہوا گھر ہے اور بہت لائق عزت ہے تبع نے اُن مفسدوں کو سزا دی اور خود اُسے خانۂ کعبہ کے ساتھ غائبانہ عقیدت پیدا ہو گئی، چنانچہ اُس نے مکۂ معظمہ آکر خانۂ کعبہ کا طواف کیا اور مراسم حج ادا کیے اور خانۂ کعبہ پر غلاف چڑھائے اور اُس کے احترام کے تحفظ کے لیے کچھ احکام نافذ کیے وکان تبع فیما یزعمون اول من کسا البیت واوصی به (ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۱۴)

تبان کے بعد کئی بادشاہوں کے دور گزرے یہاں تک کہ کچھ نقلا کے بعد ایک شخص نے جس کا نام ذو نواس تھا سلطنت یمن پر قبضہ کر لیا اور حمیری

سلاطین کی حکومت ختم ہو گئی۔ اس نے اہل یمین کو یہودی مذہب کے اختیار کرنے پر مجبور کرنا چاہا، اور جب اُنھوں نے اس کی اطاعت سے اس بارے میں انکار کیا تو اس نے اُن کا قتل عام کرا دیا۔ ابونواس کے خلاف قیصر روم سے امداد طلب کی گئی۔ اُس نے عیسائیت کی حمایت کے لیے نجاشی بادشاہ حبشہ کو امداد کے لیے کہا، جس نے ستر ہزار کا لشکر اریاط کی قیادت میں یمن روانہ کیا اسی فوج کا ایک سردار ابرہہ اشرم تھا۔ بعد میں اریاط اور ابرہہ میں مقابلہ ہوا، اریاط قتل ہوا اور ابرہہ تمام یمن کا بادشاہ ہو گیا۔

ابرہہ نے صنعاء میں ایک گرجا تعمیر کرایا، جس کے متعلق اس کا خیال یہ تھا کہ دنیا میں اس کی کوئی نظیر نہیں ہوگی۔ اور اس نے منصوبہ باندھا کہ تمام عرب کے حج کا مرکز اسے قرار دے مگر خانہ کعبہ کی مرکزیت جو مدتوں سے قائم تھی اُس کے اس مقصد میں سدّ راہ تھی۔ اس لیے اُس نے طے کیا کہ وہ اپنی فوجی طاقت سے کعبہ کو منہدم کر دے گا۔ چنانچہ وہ ایک بڑی فوج لے کر روانہ ہو گیا۔ اس خبر سے تمام عرب میں تھلکہ پڑ گیا اور راستے میں کئی جگہ کچھ قبائل نے سدّ راہ ہونے کی کوشش کی مگر ہر ایک کو شکست ہوئی یہاں تک کہ وہ مکہ معظمہ کے پاس تک پہونچنے میں کامیاب ہو گیا۔

انجام کار

مکہ میں کوئی فوجی طاقت نہ تھی۔ راستے میں جو جو قبیلے سدّ راہ

ہوئے تھے، سب شکست کھا چکے تھے، بظاہر اسباب ابرہہ کے مقصد میں کوئی چیز اب مزاحم نہ تھی۔ مگر عبدالمطلب کی روحانی بصیرت نے انھیں بالکل مطمئن بنائے ہوئے تھی، ابرہہ نے بیرون مکہ قیام کر کے اُن کے پاس پیغام بھیجا کہ ہمیں تم لوگوں سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ ہمیں تو صرف اس گھر کو منہدم کرنا ہے، اس لیے اگر تم ہمارے سدِ راہ نہ ہو تو ہم تم سے کوئی تعرض نہ کریں گے۔ عبدالمطلب نے جواب دیا کہ جنگ کی تو ہم میں طاقت ہے ہی نہیں۔ رہ گیا گھر۔ وہ ہمارا نہیں۔ خدا کا ہے اگر وہ تمھارا مزاحم نہ ہو تو ہمیں اُس سے کوئی سروکار نہیں پھر جب ابرہہ سے مُنھ در مُنھ بات چیت ہوئی تو عبدالمطلب نے اپنے اُن مویشیوں کے بارے میں احتجاج کیا جو ابرہہ کی فوج والوں نے اپنے قبضہ میں کر لیے تھے۔ ابرہہ نے کہا "تعجب ہے کہ آپ اپنے مویشیوں کے بارے میں مجھ سے خواہش کر رہے ہیں، اور اس خانۂ مقدس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے، جس سے آپ کی قومی عزت وابستہ ہے۔"

عبدالمطلب نے بڑے اعتماد کے ساتھ ان تاریخی الفاظ میں جواب دیا۔ انی انا رب الابل وان للبیت ربا سیمنعہ ان اونٹوں کا مالک میں تھا، اس لیے اُن کے بارے میں میں نے کہا، اور گھر کا مالک ایک اور ہے جو اُس کی خود حفاظت کر لے گا۔

(ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۳۱ و ۳۲)

ان الفاظ میں حقانیت کا وہ وزن ہے جس کا مقابلہ ہفت آسمان

بھی نہیں کر سکتے۔ ان الفاظ کے کہنے کا حق صرف اُسے ہی ہو سکتا ہے جو منشائے قدرت کو دل کی آنکھوں سے صاف دیکھ رہا ہو۔

ابرہہ جناب عبد المطلب کے انتباہات سے ہوشیار نہیں ہوا اور اپنے ارادہ پر اٹل رہا۔ عبد المطلب نے اہل مکہ کو کہا کہ وہ مکہ سے نکل جائیں اور جا کر پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں پناہ لے لیں اور خود عبد المطلب نے کچھ مخصوص افراد قریش کی معیت میں آخری بار زنجیر خانہ کعبہ کو پکڑ کر ان اشعار کی شکل میں مناجات کی۔

لاھم ان العبد یمنع رحلہ فامنع حلالک
لا یغلبن صلیبھم ومحالھم ابدا محالک
ان کنت تارکھم وقبلتنا فامر ما بدا لک

خلاصہ یہ ہے کہ ہر ایک اپنے گھر کی حفاظت خود کرتا ہے اب تو بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما۔

یہ مناجات کر کے وہ خاموش نتیجہ کے منتظر ہو گئے۔

ابرہہ اپنی مادی قوت پر پورے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ آگے بڑھا مگر نتیجہ وہی سامنے آگیا جس سے عبد المطلب کا روحانی ضمیر باخبر تھا۔ طیر ابابیل کا غیبی لشکر آیا اور ابرہہ مع اپنے تمام لشکر کے تباہ و برباد ہو گیا۔ اس غیر معمولی مظاہرۂ قدرت کو شعرائے عرب نے نظم کیا اور اسے اپنے اشعار کے ذریعہ سے تاریخ عرب کا ناقابل انکار واقعہ بنا دیا جس کی طرف اشارہ قرآن کریم نے سورۂ فیل کی صورت میں کیا ہے

عرب شعراء کے یہ کثیر التعداد اشعار ابن ہشام نے اپنی کتاب سیرت میں درج کیے ہیں۔

عبدالمطلب کے بعد

عبدالمطلب کے دس بیٹے اور چھ بیٹیاں تھیں۔ بیٹوں کی تعداد کے لحاظ سے عبدالمطلب کو "ابوالسادۃ العشر" کہا جاتا ہے۔ بیٹوں کے نام یہ ہیں۔

عبداللہ۔ ابوطالب۔ حمزہ۔ عباس۔ زبیر۔ حارث۔ حجل۔ مُقوم۔ ضرار اور ابولہب۔ ان میں سے پہلی تین شخصیتوں کو تاریخ اسلام میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ عبّاس بھی مسلمان ہوئے جن کی نسل میں سلاطین بنی عباس مشہور ومعروف ہیں۔ ابولہب کا نام مخالفت کے لحاظ سے تاریخ میں نمایاں ہے۔

عبداللہ

یہ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰؐ کے والد بزرگوار ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ عبدالمطلب نے زمزم کے کھودنے کے موقع پر جب قریش نے ان کی مخالفت کی اور انھیں اپنی تنہائی کی وجہ سے بے بسی کا احساس ہوا اس لیے کہ اس وقت ان کے فقط ایک فرزند حارث تھے اور وہ بھی کمسن تو انھوں نے نذر مانی کہ اگر ان کے بیٹوں کی تعداد

پوری دس ہو جائے تو وہ ان میں سے ایک کو راہ خدا میں قربان کردیں گے۔ خداوند عالم نے اُن کی تمنّا کو پورا کیا اور دس بیٹے اُن کے ہو گئے اب انھیں اپنی نذر کا خیال آیا اور ننھیال والوں کو بُلاکر نذر کی اطلاع دی۔ سب نے اس کی تکمیل پر آمادگی ظاہر کی۔ جناب عبدالمطلب نے طے کیا کہ وہ قرعہ ڈالیں گے اور جس کے نام نکلے گا اُسی کی قربانی ہوگی۔ قرعہ ڈالا گیا تو وہ عبداللہ کے نام پہ نکلا۔ تمام قوم جمع ہو کر سدّ راہ ہوی اور کہا کہ اس کے عوض میں اونٹوں کی قربانی کر دو مجبور ہو کر عبدالمطلب نے عبداللہ کے بالمقابل دس اونٹوں کے نام پر قرعہ ڈالا مگر قرعہ عبداللہ ہی کے نام نکلا، پھر بیس اونٹوں کے لیے قرعہ ڈالا اور اسی طرح دس دس اونٹ بڑھاتے رہے مگر ہر دفعہ قرعہ عبداللہ ہی کے نام نکلتا تھا، آخری مرتبہ جب پورے سو اونٹوں کے ساتھ قرعہ اندازی کی تو قرعہ اونٹوں کے نام نکل آیا۔ یہ ایک منشاء قدرت کی تکمیل تھی جس کا ظہور بعد میں اس طرح ہوا کہ شریعت اسلام میں ایک انسان کے مقابل میں دیت یعنی اس کے خون کا معاوضہ سو ہی اونٹ مقرر کی گئی ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے اپنے پدر بزرگوار کے زیر سایہ پروان چڑھنے کا موقع نہیں ملا اس لیے کہ ایک قول کے مطابق حضرت ابھی شکم مادر ہی میں تھے اور دوسرے قول کے مطابق پیدا ہو چکے تھے مگر بہت کمسن تھے کہ جناب عبداللہ کا انتقال ہو گیا۔

ابو طالب

یہ حضرت پیغمبر اسلامؐ کے سگے چچا۔ آپ کے والد بزرگوار جناب عبد اللہ کے حقیقی بھائی تھے۔ دونوں کی والدہ فاطمہ بنت عمرو مخزومی تھیں۔ جناب عبد المطلب کے بعد ابو طالب کی پوری زندگی پیغمبر اسلامؐ اور پھر خود اسلام کی حفاظت و امداد میں گذری جس کی شہادت آغاز تاریخ اسلام کا ہر ہر قدم دے گا اور اس کا ذکر اپنے محل پر آئے گا۔

پیغمبر اسلامؐ کی ولادت

جب وفات پیغمبرؐ کی تاریخ مسلمانوں میں متفق علیہ نہ رہ سکی تو ولادت کی تاریخ میں اختلاف ہونا کون تعجب خیز ہے۔ غنیمت یہ ہے کہ مہینہ متفق علیہ ہے یعنی ربیع الاول مگر اس مہینہ میں کس دن حضرت متولد ہوئے اس بارے میں اہلسنت میں متعدد قول ہیں۔ دوسری۔ آٹھویں۔ دسویں اور زیادہ مشہور بارھویں تاریخ ہے۔ علمائے امامیہ میں سے کلینیؒ بھی بارھویں کے قائل ہیں لیکن زیادہ تر علمائے شیعہ سترہ ربیع الاول کو ولادت مانتے ہیں۔ چونکہ اس فرقہ کا دارومدار اہلبیت رسولؐ پر رہا ہے اس لیے اُن کا اس تاریخ پر تقریباً متفق ہونا اس کا پتہ دیتا ہے کہ اہلبیتؑ سے ان کو یہی علم حاصل ہوا تھا اور ظاہر

ہے کہ گھر کی بات میں گھر والوں سے زیادہ کس کا بیان معتبر سمجھا جا سکتا ہے۔

نشوونما

عرب میں شہر کے ماحول کو زبان کے خراب ہونے کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا اس لیے بچوں کو زمانہ رضاعت ہی میں بادیہ نشین عربوں میں بھیج دیا جاتا تھا۔ جن کے متعلق یہ امر مسلّم تھا کہ اُن کی زبان اپنی اصلی فصاحت پر باقی ہے۔ چنانچہ حضرتؐ کے لیے بھی پیدائش کے بعد ایسا ہی انتظام کیا گیا اور قبیلۂ بنی سعد کی ایک خاتون حلیمہ بنت عبداللہ آپ کی مرضعہ مقرر ہوئیں اور آپ نے جوان ہونے تک اُسی قبیلہ میں قیام کیا۔

یتیم الابوین

پدر بزرگوار کا سایہ تو پہلے ہی اُٹھ چکا تھا۔ ۶ برس کا سن تھا کہ آپ کی والدہ بھی دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ وہ آپ کو لے کر مدینہ اپنے میکے والوں سے ملنے گئی تھیں۔ واپسی میں بیمار ہوئیں اور مقام ابواء پر انتقال کیا۔ (طبقات ابن سعد و سیرت ابن ہشام)

بعض علمائے نفسیات کا خیال ہے کہ خود اعتمادی اور برداشت مشکلات کے لیے بسا اوقات یتیمی مددگار ہوتی ہے۔ خالق نے اپنے

رسول ؐ کو بچپن ہی میں باپ اور ماں دونوں کے سہارے سے محروم کرکے اُن کے جوہر کمال میں اضافی اسباب کے تصور کا خاتمہ کردیا۔ بقول امیر الشعراء شوقی بک مصری ؎

نعم الیتیم بدات مخائل فضلہ　　والیتم رزق بعضہ وذکاءٓ

دادا کی تربیت

باپ اور ماں دونوں کا سایہ سر سے اُٹھنے کے بعد حضرت محمد مصطفیٰؐ کی تربیت کے کفیل آپ کے جدِ بزرگوار جناب عبدالمطلب ہوئے اور اس فریضہ کو باہتمام تمام انجام دیتے رہے۔ ایسی محبت اور توجہ کے ساتھ کہ جس سے خود اُن کی اولاد بھی اس درجہ بہرہ ور نہ تھی۔

قبضہ الیہ جدہ عبدالمطلب ورق علیہ رقۃ لم یرقہا علی ولدہ (طبقات ابن سعد ج ۱ صفحہ ۷۸)

عبدالمطلب کی آنکھیں بچپن ہی میں آپ سے عظمت وجلالت . . . . کا اندازہ کررہی تھیں۔ چنانچہ ان کے لیے جو مسند کعبہ کے پاس بچھائی جاتی تھی اس پر ان کی عدم موجودگی میں اُن کے صاحبزادوں میں سے کسی کی مجال نہ تھی کہ بیٹھ جائے مگر رسول ؐ اسی بچپنے کے عالم میں آتے تھے تو بے تکلف اس مسند پر بیٹھ جاتے تھے اور آپ کے چچا آپ کو ہٹانا چاہتے تھے اور عبدالمطلب دیکھ لیتے تھے تو فرماتے تھے کہ میرے بچہ کو یہیں بیٹھنے دو۔ بخدا اس کی ایک بڑی شان ہے جو ظاہر

ہو کر رہے گی (ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۰۸)

ابوطالب کی مشفقانہ پرورش

حضرت محمد مصطفےٰؐ کی عمر آٹھ برس کی تھی کہ آپ کے بزرگ مرتبہ اور انتہائی شفیق دادا کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔

وقت وفات اپنے فرزند حضرت ابوطالب کو جو پیغمبر اسلامؐ کے حقیقی چچا تھے آپ کی تربیت کے لیے وصیت کی۔ حالانکہ وہ اپنے باپ کی اولاد میں نہ تو سن میں سب سے بزرگ تھے اور نہ وہ دولتمند ہی تھے مگر عبدالمطلب نے اس خدمت کے لیے انہی کو منتخب کیا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ پیغمبر اسلام کے والد بزرگوار عبداللہ سے انھیں انتہائی محبت تھی اور پھر اب تک خود رسول خداؐ کے متعلق عبدالمطلب نے محسوس کر لیا ہو گا کہ آپ سے انھیں جو محبت ہے وہ کسی کو نہیں اور اس کے علاوہ شاید سب سے بڑی وجہ یہ ہو کہ ابراہیمی نسل میں جو صفات و اخلاق توارث کے طور پر چلے آ رہے تھے اور جن کی تکمیل کے لیے قدرت نے اس آخری رسول کو بھیجا تھا ان صفات کے حامل اولاد جناب عبدالمطلب میں اب ابوطالب ہی نظر آتے تھے۔ لہذا انہی کی آغوش عطوفت اس پیغمبر کے لیے موزوں و مناسب معلوم ہو رہی تھی۔ چنانچہ جناب ابوطالب نے جس شفقت و محبت سے رسول اللہؐ کی پرورش کی ہے وہ تاریخ کی ایک متفق علیہ اور مثالی

حقیقت ہے۔ آثار کے مشاہدہ سے یہ امر نمایاں تھا کہ جیسی محبت انھیں رسول اللہؐ سے ہے وہ اپنی اولاد سے بھی نہیں ہے جیسا کہ مورخ ابن سعد نے لکھا ہے :-

كان يحبه حبا شديدا لا يحبه ولده وكان لا ينام الا الى جنبه ويخرج فيخرج معه وصب به ابوطالب صبابة لم يصب مثلها بشئ قط وكان يخصه بالطعام وكان الصبيان يصبحون رمصا شعثا ويصبح رسول اللهؐ دهينا كحيلا (طبقات مطبوعہ لنڈن ج ۱ صفحہ ۷۵ و ۷۶)

سفر شام

حضرت کی عمر ۱۲ برس کی تھی جب ابوطالب نے ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ شام کا سفر کیا (ابن سعد ج ۱ صفحہ ۷۶)

پیغمبر خداؐ نے اصرار کیا کہ میں بھی ساتھ چلوں گا۔ ابوطالب نے آپ کو بھی ساتھ لے لیا۔ (ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۱۱۳)

اس سفر میں بحیرا راہب سے ملاقات ہوئی صرف اتنی دیر کے لیے کہ ابوطالب نے اثناء سفر میں اس کے گرجا کے پاس منزل کی اور اس نے رسولؐ کے چہرہ اور آپ کے خط و خال پر نظر ڈال کر خود ہی آپ کے متعلق دریافت کیا اور ابوطالب کو ہدایت کی کہ ان کی حفاظت کرو اور یہود سے ہوشیار رہو۔ کہیں حسد کی وجہ سے انھیں کوئی نقصان

نہ پہنچائیں بلکہ منع کیا کہ انھیں وطن واپس کر دو اور شام نہ لیجاؤ مگر جناب ابوطالب نے کہا کہ اللہ کی حفاظت کافی ہے

(ابن سعد)

اتنی بنیاد پر عیسائیوں نے یہ عمارت کھڑی کی ہے کہ قرآن میں جو امم سابقہ کے حالات اور مذہبی حقائق و معارف ہیں وہ بحیرا راہب سے ماخوذ ہیں۔ صورتِ واقعہ کی نوعیت سے ظاہر ہے کہ عیسائیوں کا اس "تنکے" سے سہارا لینا رسولؐ کی عظمت کے مقابلے میں بحرِ حیرت کے اندر خود ان کے ڈوبتے ہونے کی دلیل ہے۔

سیرت کی بلندی

ابتدائی عمر سے پیغمبر خداؐ کی بلندی کردار اور پاکیزگی اخلاق کا ہر مشاہدہ کرنے والے کو احساس ہوتا تھا۔ جاہلیت کے غلط رسوم و عادات سے آپ قطعی بے تعلق رہتے تھے اور مروت، انصاف۔ امانت داری۔ حسن معاشرت۔ حقوق ہمسایہ کی ادائیگی حلم و برداشت اور راست گفتاری میں تمام قوم کے افراد سے امتیاز خاص کے مالک نظر آتے تھے۔ اسی لیے قریش کے لوگ عموماً آپ کو "امین" کے نام سے یاد کرنے لگے۔

(ابن سعد ج ۱ صفحہ ۷۶
ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۱۱۵)

حلف فضول

رسول اللہؐ کی عمر ۲۰ برس کی تھی جب قریش کے درمیان وہ معاہدہ ہوا جسے "حلف الفضول" کہتے ہیں۔ قریش کے تمام قبائل بنی ہاشم۔ بنی اسد۔ بنی زہرہ اور بنی تیم کے نمائندے عبداللہ ابن جدعان تیمی کے مکان پر جمع ہوئے اور یہ عہد ہوا کہ ہم مظلوموں کی مدد کریں گے چاہے وہ اس دیس کے باشندے ہوں یا پردیس سے آئے ہوئے ہوں اور حقدار کے حق کی حمایت کریں گے اور جب تک اس کا حق نہ مل جائے چین نہ لیں گے۔ اس قسم کے عہد کی تحریک پیغمبر خداؐ کے ایک چچا زبیر بن عبدالمطلب نے کی تھی اور تاریخ عرب میں اب تک اس شریفانہ اصول پر کوئی معاہدہ نہیں ہوا (طبقات ابن سعد ج ۱ صفحہ ۸۲)

پیغمبر خداؐ اس عہد میں شریک ہونے پر ہمیشہ اظہار مسرت فرماتے رہے اور آپ مبعوث بہ رسالت ہونے کے بعد بھی اس معاہدے کے علمبردار رہے، آپ فرماتے تھے کہ اب دین اسلام کے نفاذ کے بعد بھی کوئی مجھے اس معاہدہ کی بنا پر آواز دے تو میں اسے لبیک کہوں گا

شام کا دوسرا سفر

جب حضرتؐ کی عمر شریف ۲۵ سال کی تھی تو اس وقت آپ کو

شام کا دوسرا سفر درپیش ہوا۔

واقعہ یہ تھا کہ خدیجہ بنت خویلد عرب کی ایک بہت باعزت مالدار تاجرہ تھیں۔ وہ مختلف اشخاص کو اپنا مال تجارت دیکر شام کی طرف ہر سال روانہ کیا کرتی تھیں اور مضاربہ کے اصول پر ان کے لیے منافع کا کوئی حصہ مقرر کر دیا کرتی تھیں۔ اس مرتبہ خواہ جناب ابوطالب کی تحریک سے خود حضرت محمد مصطفےٰؐ نے اپنے کو اس کام کے لیے پیش کیا ہو جیسا کہ ابن سعد نے لکھا ہے (طبقات جلد ۱ صفحہ ۸۳) اور خواہ خود خدیجہ نے آپ کی سچائی اور امانتداری کے چرچے سن کر آپ سے خواہش کی ہو کہ آپ، اس ذمہ داری کو قبول فرمالیں جیسا کہ ابن ہشام نے لکھا ہے۔

(سیرت ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۱۸)

بہر صورت یہ امر متفق علیہ ہے کہ جناب خدیجہ نے پہلے ہی آپ کے سامنے یہ پیش کش کی کہ جتنا وہ ہمیشہ کسی دوسرے کو دیا کرتی تھیں اس سے دونا وہ آپ کو دیں گی۔ اس سے دوسرے قول کی تائید ہوتی ہے کہ جناب خدیجہ آپ کے ممتاز اوصاف سے واقف ہونے کی بنا پر خود اس کی خواہشمند تھیں کہ یہ کام آپ کے ہاتھوں انجام پائے۔ باوجودیکہ آپ کو یہ پہلا تجربہ تھا مگر آپ کی سچائی۔ امانتداری اور معاملہ فہمی کا یہ اثر تھا کہ آپ کے ہاتھ سے خدیجہ کو نفع بھی ہر مرتبہ کی بہ نسبت دونا ہوا اور اس لیے انھوں نے آپ کی خدمت میں نذرلا

اپنی قرارداد سے بھی زیادہ پیش کیا۔

خانہ آبادی

خدیجہ بنت خویلد ممتاز قبیلہ قریش کی محترم خاتون تھیں۔ آپ کا سلسلہ نسب تین پشتوں کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نسب سے متحد ہو جاتا تھا، اس طرح

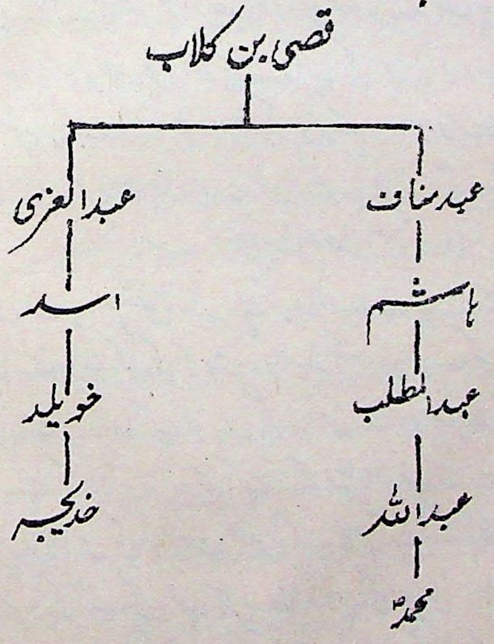
قصی بن کلاب
عبد مناف
ہاشم
عبد المطلب
عبد اللہ
محمدؐ
عبد العزیٰ
اسد
خویلد
خدیجہ

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ رشتہ میں حضرت پیغمبر خدا سے

بڑی تھیں اور بلحاظ طبقہ آپ کے والد بزرگوار جناب عبد اللہ کے موازی ہوتی تھیں اور اس لیے عمر میں بھی آپ سے بڑا ہونا خلاف توقع نہیں ہے چنانچہ مورخین بتاتے ہیں کہ حضرت کی عمر بوقت عقد ۲۵ سال کی تھی (ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۱۱۸) اور جناب خدیجہؓ کی عمر ۴۰ برس کی تھی (ابن سعد ج ۱ صفحہ ۸۴)

جناب خدیجہؓ کے والد کا حرب فجار کے پہلے انتقال ہو گیا تھا (ابن سعد ج ۱ صفحہ ۸۴) مگر ایک دوسری روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے والد زندہ تھے اور پیغمبر خداؐ کے ساتھ ان کی شادی ان کے والد ہی نے کی (سیرت ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۱۱۰) لیکن غالباً پہلی روایت زیادہ درست ہے۔

خاندانی عظمت کے علاوہ اللہ نے اُنھیں مال و دولت بھی بہت عطا کیا تھا اور تمام قریش کے لوگوں پر ان کی عزت و وجاہت کا اثر قائم تھا۔ اس صورت میں جیسا کہ ابن سعد نے لکھا ہے قریش میں سے ہر شخص اُن سے نکاح کرنے کا آرزومند تھا اور اس کے لیے بڑی دولت لٹانے کے لیے تیار تھا (طبقات ج ۱ صفحہ ۸۴) مگر حضرت محمد مصطفےٰؐ کی امانتداری اور سچائی جس کا اس تجارتی مہم کے سلسلہ میں جناب خدیجہؓ کو تجربہ ہو چکا تھا کچھ ایسی ان کے دل پر اثر انداز ہوئی کہ انھوں نے خود ایک خاتون نفیسہ بنت منبہ کو بھیج کر حضرت کو آمادہ کرایا کہ آپ خدیجہ کی خواستگاری فرمائیں۔

نفیسہ حضرتؐ کے پاس آئیں اور کہا، کیا بات ہے؟ آپ شادی کیوں نہیں کرتے؟ حضرت نے فرمایا میرے پاس پیسہ نہیں ہے کہا کہ اگر اس کی ضرورت نہ ہو اور پھر بھی آپ کو ایسی شریک حیات مل جائے جس میں حسن و جمال، دولت و مال، شرف اور عزت سب اوصاف جمع ہوں اور وہ نسبی حیثیت سے آپ کی برابر والی بھی ہو تو؟ آپ نے فرمایا، ایسی کون ہے؟ انھوں نے کہا خدیجہ۔ فرمایا اس کی کیا صورت ہے؟ نفیسہ نے کہا میں اس کی ذمہ دار ہوں۔ حضرت نے فرمایا۔ اچھا تو پھر مجھے منظور ہے۔ اس جواب کو سُن کر وہ خوشی خوشی خدیجہ کے پاس گئیں اور اُنھیں اطلاع دی۔ یہ معلوم ہونے پر جناب خدیجہ نے رسول اللہؐ کے پاس کہلوا بھیجا کہ آپ فلاں دن فلاں وقت تشریف لائیں۔ اس کے علاوہ اپنے چچا عمرو بن اسد سے کہلوا بھیجا کہ وہ ان کی شادی حضرت کے ساتھ کر دیں چنانچہ روز معین پر حضرتؐ مع جناب ابوطالبؓ اور دیگر اعمام کے وہاں تشریف لے گئے۔ (ابن سعد ج ا ص ۸۴)

جناب خدیجہ کی طرف سے اُن کے چچا عمرو بن اسد نے اور جناب رسالتمآبؐ کی جانب سے جناب ابوطالبؓ نے صیغۂ نکاح جاری فرمایا۔ اور تقریب عقد بخیر و خوبی عمل میں آئی۔

جناب ابوطالب نے صیغۂ عقد جاری کرنے سے قبل اس مجمع میں جو خطبہ پڑھا تھا وہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔

انھوں نے کہا :-

الحمد لله الذی جعلنا
من زرع ابراهیم و ذریة
اسمعیل وجعل لنا بیتا محجوجا
وحرما آمنا یجبی الیه ثمرات
کل شیٔ وجعل لنا الحکام
علی الناس فی بلدنا الذی
نحن ثم ان ابن اخی
محمد بن عبد الله بن
عبد المطلب لا یوزن
برجل من قریش الا رجح
ولا یقاس باحد منهم
الا عظم عنه وان کان
فی المال قل فان المال
رزق حائل وظل زائل
وله فی خدیجة رغبة
ولها فیه رغبة والصداق
ما سألتموه عاجله
واجله من مالی وله

ہر تعریف اللہ کے لیے جس نے ہمیں ابراہیم کی
نسل میں اور اسمٰعیلؑ کی اولاد میں قرار دیا اور
اور ہمارے لیے ایک گھر بنایا جس کا حج کیا
جاتا ہے اور ایک حرم جو مرکز امن و امان
ہے اور جہاں ہر طرح کے میوے سمٹ کر آتے
ہیں اور ہمیں اپنے اس شہر میں جہاں
ہم ہیں خلق کے قضایا کا طے کرنے والا حاکم
بنایا۔ اما بعد بلاشبہ میرا بھتیجا محمد بن
عبد اللہؐ وہ ہے جس کا قریش کے کسی بھی
آدمی سے موازنہ کیا جائے تو اس کا پلہ
گراں نظر آئے گا اور جس سے بھی اس کی
نسبت دیکھی جائے یہ اُس سے بڑا معلوم
ہوگا اور اگر وہ مال و دولت میں کم ہے تو
اس سے کیا ہے۔ مال تو ایک وقتی نعمت
اور ناپائیدار چھاؤں ہے۔ صورت حال
یہ ہے کہ اسے خدیجہ کی طرف اور خدیجہ کو
اس کی طرف رغبت ہے۔ مہر جتنا تم کہو
معجل اور مؤجل ہر طرح میں اپنے مال سے

خطیب عظیم و شان
رفیع و لسان شافع
جسیم

(اعلام الوری طبرسی رحمۃ اللہ)

ادا کروں گا اور اس کے علاوہ اس ہستی
کی ایک عظیم شان اور بلند منزل اور مقبول
بارگاہ خدا بات ہے جو بڑی اہمیت کی
حامل ہے۔

اس خطبہ کے الفاظ اپنے متکلم کی گہری معرفت اور رسول خداؐ کے حال و مستقبل کے مراتب سے کامل واقفیت کا ثبوت ہیں اور اُس کے انداز بیان کی بلندی کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ معنًی ہی نہیں بلکہ کئی جگہ لفظاً بھی اس کلام ربانی کے مطابق ہے جو ابھی دنیا میں اُترا بھی نہ تھا۔

"مسلمانانِ عالم" کا مصنف لکھتا ہے کہ

"بارہ اونس سونا اور پچیس اونٹ حق مہر مقرر ہوا جو چچا ابو طالبؓ کی فیاضی سے فوراً ادا کر دیا گیا

(صفحہ ۳۸)

جناب خدیجہ کبریٰ کی یہ دو خصوصیتیں متفق علیہ ہیں کہ وہ سب سے پہلی بی بی ہیں جن سے حضرت رسول خداؐ نے عقد فرمایا اور یہ کہ ان کی زندگی میں حضرتؐ نے کوئی دوسری شادی نہیں فرمائی اس کا ابن ہشام نے ان الفاظ میں اظہار کیا ہے کہ:-

کانت اوّل امرأۃ تزوجها رسول اللہ ولم یتزوج
علیها غیرها حتی ماتت (سیرت صفحہ ۱۱۹)

ابوالفداء نے لکھا ہے :-

ھی اول امراۃ تزوجھا ولم یتزوج غیرھا حتی ماتت۔

یہی دیگر مورخین کی بھی تصریح ہے جس کے خلاف کوئی ضعیف سے ضعیف روایت بھی نہیں ہے مگر ان کا بیوہ ہونا اور قبل میں کسی اور شوہر کے حبالۂ عقد میں ہونا متفق علیہ نہیں ہے بلکہ ایک روایت اس کی موجود ہے کہ رسولؐ کے ساتھ خود ان کا بھی یہ پہلا ہی عقد تھا (مناقب ابن شہر آشوب)

مذکورۂ بالا ان کی خصوصیت کی قدر و قیمت اس وقت بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ آل رسولؐ اور وارثان تعلیمات رسولؐ میں بادشاہوں کی بیٹیاں آئیں مگر ان کی یہ رعایت نہیں کی گئی کہ ان کی موجودگی میں کسی دوسری خاتون سے تعلقات ازدواجی قائم نہ کیے جائیں یہاں تک کہ دختر مامون الرشید نے اس کی شکایت امام محمد تقی علیہ السلام کے خلاف اپنے باپ سے کی تو اس نے امام کے نقطۂ نظر کو محسوس کرتے ہوئے جواب دیا کہ

"میں ان پر حلال خدا کو حرام تھوڑی کر سکتا ہوں"

مگر تاریخ اسلام میں ایک یہ خصوصیت حضرت سیدۃ النساء فاطمہ زہراؑ کی ملتی ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام نے ان کی موجودگی میں کوئی دوسرا عقد نہیں فرمایا اور ایک اُن سے پہلے

ان کی والدہ معظمہ حضرت خدیجہ رضہ کی کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی حیات میں کوئی دوسری شادی نہیں فرمائی اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان حضرات کو اس حلال خدا کے ترک پر کوئی دنیوی جاہ وحشم آمادہ نہیں کرسکتا تھا مگر صرف صفات کی رفعت اور پیش خدا اعزاز کی بلندی وہ ہوسکتی تھی جو کسی خاتون کو اس خصوصیت کا حقدار بنادے۔ اس سے بلاشک وشبہہ یہ امر پایۂ ثبوت تک پہونچتا ہے کہ جس طرح حضرت خاتون جنت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کو حضرت علی علیہ السلام کے ازواج میں جو مرتبہ حاصل تھا وہ کسی بیوی کو حاصل نہ تھا اسی طرح جناب خدیجۂ کبریٰ کا ازواجِ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں۔ جو مرتبہ حاصل تھا وہ کسی دوسری خاتون کو حاصل نہیں تھا۔

بنائے کعبہ

حضرت رسولؐ کی عمر ۳۵ سال کی تھی کہ قریش نے کعبہ کی نئی تعمیر کا کام انجام دیا۔ کہا جاتا ہے کہ پہاڑوں کی درمیانی وادی کے پانی کا بہاؤ کعبہ کی سمت تھا اور کعبہ میں اس وقت تک کوئی چھت نہ تھی، اس لیے جب سیلاب آتا تھا تو پانی کعبہ کی دیواروں کے اوپر سے عمارت کے اندر داخل ہوجاتا تھا اور اس میں شگاف پیدا کردیتا تھا۔ اس لیے اس کے انہدام کا خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ اس کے

علاوہ کعبہ کا سامان چوری جانے لگا اور اس وقت تک کعبہ سے متعلق ایک خزانہ محفوظ تھا جو جوف کعبہ میں ایک کنویں کے اندر تھا۔ یہ دفینہ چوری ہو گیا (ابن ہشام ج ۱ صفحہ ۱۲۲)

ابن سعد نے اس کی تفصیل لکھی ہے کہ کچھ زیور اور سونے کا بنا ہوا ایک ہرن چوری ہو گیا۔ لہذا قریش نے طے کیا کہ کعبہ کی عمارت کو گرا کر از سر نو اس کی تعمیر کی جائے اور اسے مسقف کر دیا جائے (طبقات ج ۱ صفحہ ۹۳)

اس کے لیے قریش کی ایک ممتاز شخصیت نے کھڑے ہو کر آواز دی کہ اے گروہ قریش اس کا خیال رکھنا کہ اس تعمیر میں تمھاری حلال کمائی کے سوا کوئی حرام کا پیسہ مثلاً زناکاری کا معاوضہ، سود کا روپیہ اور کسی سے غصب کیا ہوا مال لگنے نہ پائے۔

(ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۲۲)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قریش کے کچھ افراد میں شریعت ابراہیمی کے اثر سے کسب معاش میں حرام و حلال کا تصور موجود تھا یہ اور بات ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگ عملی حیثیت سے اس کے پابند نہ رہ گئے ہوں۔

ابن اسحاق نے تصریح کی ہے کہ یہ اعلان کرنے والے حضرات پیغمبر خدا ﷺ کی دادی کے بھائی تھے جن کا نام ابو وہب بن عمرو بن عائذ بن عمران بن مخزوم تھا۔

قریش نے اس غرض سے کہ یہ شرف کسی ایک خاندان سے مخصوص نہ ہو جائے یہ انتظام کیا کہ کعبہ کے حصے مقرر کر دیئے اور ان کے لحاظ سے تقسیم عمل کر لی چنانچہ دروازے کا حصہ اولاد عبد مناف و زہرہ سے متعلق ہوا اور رکن اسود اور رکن یمانی کی درمیانی دیوار بنی مخزوم اور کچھ دوسرے قریشی خاندانوں سے اور پشت کی طرف کا حصہ بنی جمح و سہم سے اور اسی طرح ایک طرف کا پہلو بنی عبد الدار اور بنی اسد وغیرہ سے متعلق ہوا۔ اس طرح پورا کام تعمیر کا تو ہو گیا مگر جب اس حصہ کی تعمیر کا وقت آیا جس میں حجر اسود رکھا جائے گا تو تمام قریشی قبیلوں میں اختلاف پیدا ہو گیا اور ہر ایک چاہنے لگا کہ یہ شرف اس کے حصہ میں آئے۔ یہاں تک کہ تلوار چلنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا (ابن سعد جلد ۱ ص ۹۳)

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ یہ قبائل آپس میں جنگ کرنے پہ بالکل تل گئے۔ قسما قسمی ہونے لگی یہاں تک کہ بنی عبد الدار نے ایک پیالے میں خون بھر کر اپنے سامنے رکھا اور بنی عدی کے ساتھ مل کر جان دینے کا عہد کیا اور اس کی علامت کے طور پر اپنے ہاتھ اس خون میں ڈبو دیے۔ چنانچہ عرب میں ان کا نام "لعقۃ الدم" (خون چاٹنے والے) ہو گیا اور اس کی وجہ سے چار پانچ دن تعمیر کے کام میں تعطل پیدا ہو گیا۔

(سیرت ابن ہشام ص ۱۲۴)

آخر اُن سب نے قضیہ کو ختم کرنے کے لیے یہ طے کیا جس کا محرک ایک روایت کے مطابق قریش میں کا سب سے زیادہ معمر شخص ابو امیہ بن مغیرہ مخزومی تھا کہ جو شخص سب سے پہلے باب بنی شیبہ سے مسجد میں داخل ہوتے ہوئے نظر آئے اُسے ثالث بنا دیا جائے اور جو فیصلہ وہ کرے اُسے سب منظور کرلیں۔ اس رائے پر سب نے اتفاق کرلیا۔

اب باب بنی شیبہ سے سب سے پہلے جو چہرہ نظر آیا وہ حضرت محمدؐ کا تھا۔ سب خوش ہو کر کہنے لگے کہ "یہ تو امین ہیں۔ ہم سب ان کے فیصلہ پر راضی ہیں۔" اور پورا معاملہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ حضرت نے فرمایا ایک کپڑا لاؤ۔ چنانچہ وہ لایا گیا (ابن ہشام صفحہ ۱۲۴) یا یہ کہ آپ نے خود اپنی عبا دوش سے اتاری اور اُسے زمین پر بچھا دیا (ابن سعد جلد ۱ صفحہ ۹۳) اور حجر اسود کو اُٹھا کر اُس چادر یا عبا میں رکھ دیا اور فرمایا کہ تم میں سے ہر قبیلہ کا ایک آدمی اس کے کسی گوشہ کو پکڑ لے۔ اس طرح سب نے مل کر اس کو اُٹھایا اور اس جگہ تک لائے جہاں اس کو رکھا جانا تھا جب وہاں تک اُسے لے آئے تو آپ نے بڑھ کر حجر اسود کو اپنے ہاتھ میں اُٹھایا اور اس کی جگہ پر نصب کر دیا۔

اس طرح یہ مہم پایۂ تکمیل تک پہنچی اور اس مہم کے ساتھ قریش بلکہ تمام عرب میں آپ کی شخصیت کی ایک خاص اہمیت محسوس

کی جانے لگی۔

طلوعِ آفتاب رسالت

یعنے

بعثت خاتم المرسلینؑ

دنیا نے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک کامل انسان کی حیثیت سے پہچان لیا تھا مگر ابھی اس منصب کا آشکارا ہونا باقی تھا جس کے لیے رب العالمین نے اس جوہر فرد کو پیدا کیا تھا وہ منصب آپ کی ذات کے ساتھ بدو فطرت سے وابستہ تھا اور یہ آپ کی سیرت طیبہ جو دنیا کی آنکھوں کے سامنے نمودار تھی۔ اسی منصب کی عملی تجلی تھی۔ وہ پیام جس کی تجدید و تکمیل اصلاح خلایق کے لیے آپ کو کرنا تھی اب تک آپ کی خاموش زندگی اسی پیغام کا مرقع تھی اور اسی کی طرف آپ کو زبان سے دنیا کو دعوت دینا تھی۔

اصولی حیثیت سے توحید پروردگار کی حقیقت آپ کے لیے نئی نہیں تھی، وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی ودیعت تھی جو خود آپ کے آباؤ اجداد کے پاس وراثۃً چلی آرہی تھی اور آپ کی عقل کامل جو آپ کے بلند ترین انسانی نقطہ کمال کا لازمہ تھی آپ کو

خالق کائنات کی صحیح معرفت کے حصول کی ضامن تھی جس کے لیے کسی غار میں بیٹھ کر سوچنے اور مراقبہ میں مصروف رہنے کی ضرورت نہ تھی مگر حکمت ربانی اس کی متقاضی تھی کہ آپ اپنا پیغام دنیا تک نمائندہ الٰہی ہونے کی حیثیت سے پہنچانے اُس وقت تک کھڑے ہوں جب تک کہ آپ کی کمال سیرت کا اثر پورے طور سے خلق پر نہ ہو جائے اور وہ آپ کے بلند اخلاقی اوصاف کے پورے قائل نہ ہو جائیں تاکہ آپ جب دعوائے رسالت فرمائیں تو ان کا وہی اقرار و اعتراف نیک فطرتوں کے لیے آپ کی جانب رہنمائی اور بدسرشتوں کے خلاف آپ کی طرف سے حجت تمام ہونے کا ذریعہ بنے اس کے لیے ضرورت تھی کہ اس وقت کے پہلے آپ سے کوئی قول یا فعل ایسا ظاہر نہ ہو جس سے اُنھیں محسوس ہو کہ آپ کوئی دعویٰ کرنے والے ہیں یا وہ وحشت محسوس کریں کہ یہ کسی خاص دین کے مبلغ ہیں۔

یہ وجہ تھی کہ آپ اُس معبود حقیقی کے فرائض عبادت ادا کرنے کے لیے تنہائیوں کو پسند فرماتے تھے اور بعثت کے کئی سال پہلے سے آپ نے غار حرا کو اپنی عبادت کا مرکز بنا لیا تھا۔ اس طرح کے تصوّرات بھی بالکل غلط ہیں کہ اللہ کی طرف کا پیغمبر خود اپنی حقیقت سے واقف نہ ہو یا وہ پیغام ربانی یا صدائے آسمانی سے وحشت و دہشت محسوس کرے یا اُسے وحی الٰہی کی شناخت میں دوسرے

آدمیوں سے پوچھنے اور اُن سے اطمینان حاصل کرنے کی ضرورت ہو

اس قسم کی باتیں جو مسلمانوں کی تاریخ میں نظر آئیں وہ یقیناً کچھ ایسے مخالفین اسلام کی کارستانی ہیں جو مسلمانوں کے لباس میں ہو کر مسلمانوں کے ساتھ گھل مل گئے تھے اور دنیوی اقتدار کے طلبگاروں نے اصل علمی مرکزوں سے نگاہوں کو ہٹانے کے لیے ان لوگوں کو علمی اہمیت دے دی جیسے عبداللہ بن سلام اور کعب الاحبار ایسے نومسلم یہودی انھوں نے شانِ رسالت کے گھٹانے کے لیے اِس قسم کی حکایتیں وضع کر دیں اور انھیں سلطنت کے زیر سایہ پروان چڑھنے والے مورخین نے ہاتھوں ہاتھ لے لیا اور ان سے اپنی تاریخوں کے صفحات سیاہ کر دیئے

ہمارے نزدیک حضرتؐ کے مبعوث برسالت ہونے کے صرف یہ معنی ہیں کہ حکمت باری متقاضی ہوئی کہ ابھی تک جو کام صرف خاموش سیرت کے مظاہرہ سے ہو رہا تھا۔ وہ اب رفتہ رفتہ اعلان قولی کی شکل اختیار کرے۔ چنانچہ اب آپ دعوائے رسالت پر مامور ہو گئے۔ اس کو ہم "بعثت" کہتے ہیں۔

یہ امر متفق علیہ ہے کہ اس وقت حضرت کی عمر شریف چالیس سال کی تھی مگر تاریخ میں اختلاف ہے۔

مورخین اہل سنت لکھتے ہیں کہ پہلی وحی آپ پر ماہ رمضان المبارک میں (ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۴۹) سترھویں تاریخ ماہ مبارک کی۔

(ابن سعد ج ۱ صفحہ ۱۲۹) آئی اور طریق اہل بیت رسول علیہم السلام سے یہ ثابت ہے کہ حضرت کی بعثت ۲۷ رجب کو ہوئی۔

(اعلام الوریٰ طبرسی رحمہ اللہ صفحہ ۲۹۳)

پہلی وحی

یہ وحی الٰہی جو سب سے پہلے نازل ہوئی سورۂ اقرأ کی پانچ ابتدائی آیتیں تھیں یعنی

بسم اللہ الرحمن الرحیم ○	سہارا اللہ کے نام کا جو سب کو فیض پہنچانے
اقرأ باسم ربک الذی	والا بڑا مہربان ہے۔ پڑھیے اپنے پروردگار کے نام کا
خلق ○ خلق الانسان من	سہارا لے کر جس نے پیدا کیا پیدا کیا انسان کو
علق ○ اقرأ و ربک الاکرم	ایک منجمد خون سے۔ پڑھیے اور آپ کا پروردگار
الذی علم بالقلم ○	سب سے بڑا صاحب کرم ہے جس نے قلم کو
علم الانسان مالم یعلم ○	ذریعۂ علم بنایا۔ انسان کو اُن باتوں کا علم
	دیا جنھیں وہ نہیں جانتا تھا۔

غور سے دیکھا جائے تو اُس قوم اور ماحول میں کہ جہاں اَن پڑھ ہونے پر فخر تھا اور قرارت و کتابت سے عاری ہونا قومی کردار کی حیثیت رکھتا تھا پہلا پیغام جو پہنچایا جا رہا ہے وہ قرارت اور کتابت کی طرف توجہ دلانے والا۔ یہ اسلام کی طرف سے عقل اور علم کے دروازوں کے

کھولنے کی اہمیت کا ایک بڑا نمایاں ثبوت ہے۔

حالانکہ بہت بڑا مرض قوم میں شرک کا تھا اور شرک کے ماتحت کتنی خرابیاں تھیں جو پھیلی ہوئی تھیں، اس لیے سورہ قُل ھُوَ اللہ کو پہلا سورہ ہونا چاہیے تھا جو باجماع مفسرین پہلا سورہ نہیں ہے بلکہ بعد کو اُترا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ شرک بڑی سے بڑی بیماری ضرور ہے مگر ہر بیماری کا ایک داخلی سبب ہوتا ہے۔ یہ شرک اور بد اخلاقیاں تو سب امراض کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ایک طبیب کی نگاہ تشخیص مرض کے بعد علاج کے سلسلہ میں سبب مرض پر جانا چاہیے اور وہ اصل سبب شرک اور تمام بد اعمالیوں کا جہالت ہوتی ہے اس لیے اسلام نے سب سے پہلے جہالت کے خلاف آواز بلند کی۔

وہ جنھوں نے تبلیغ اسلام میں تلوار کو نمایاں حیثیت دی ہے غور کریں کہ اسلام کی پہلی وحی جو آئی ہے اس میں تلوار کا نام نہیں ہے، قلم کا نام ہے مگر افسوس تو اس کا ہے کہ اس راز کو خود مسلمانوں ہی نے نہیں سمجھا ورنہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد وہ تلوار ہاتھ میں لے کر اشاعت اسلام کے لیے آگے نہ بڑھتے بلکہ قلم ہاتھ میں لے کر تعلیم و تفہیم کے لیے میدان میں آتے۔ اُس وقت مسلمانوں کی تاریخ کچھ اور ہوتی اور مسلمانوں کے ذریعہ سے اسلام کے دامن پر جو غلط قسم کے دھبے لگا دیے گئے وہ نہ لگائے جا سکتے۔

سابقین الی الاسلام

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر جو پہلا پیغام الٰہی آیا اور آپ دعوتِ رسالت پر مامور ہوئے تو فطری طور پر اور ترتیبِ تعلیم کے عقلی اصول پر اور حکمتِ تبلیغ کی بنا پر سب سے پہلے آپ کو اس پیغام کی اپنے گھر والوں کو اطلاع دینا چاہیے تھی چنانچہ ایسا ہی ہوا اور آپ کی پاک زندگی پر اندرونی اطلاع اور دل پر اُس کے قائم شدہ اثر کا نتیجہ تھا کہ گھر کے آدمیوں نے بلا توقف اس پر لبیک کہی۔

یہ گھر کے آدمی کون تھے؟ آپ کی شریکِ حیات جنابِ خدیجۂ کبریٰ جنھوں نے آپ کے بلند اوصاف اور رفعتِ کردار ہی سے متاثر ہو کر آپ کو رفاقتِ زندگی کے لیے منتخب کیا تھا۔ آپ کے چچازاد بھائی اور آپ کی آغوشِ تربیت میں مثل اولاد پرورش پانے والے حضرت علی بن ابی طالبؑ جنھوں نے آنکھ کھول کر سب سے پہلے اسی چہرۂ مبارک پر نظر کی تھی اور پھر اسی گود میں پل کر دس برس کی عمر تک پہونچے تھے جو عربی اور ہاشمی اُس دور کی نشوونما کے لحاظ سے شباب سے کچھ زیادہ دور کی عمر نہیں تھی۔ آپ کو رسالت کے جاننے اور اس کے ماننے کے لیے کسی دلیل و حجت کی ضرورت نہیں تھی اس لیے کہ وہ اُس مسمّیٰ کو آنکھ سے دیکھ رہے تھے جو وقت آنے پر رسالت کے اِسم سے

موسوم ہو گیا۔ وہ ہر وقت ساتھ تھے اور خدا کی دی ہوئی قوتِ ادراک سے اُن کمالات کا مشاہدہ کر رہے تھے جس کا بعد میں اپنے بچپن کی روداد سناتے ہوئے آپ نے خود اظہار فرمایا ہے کہ

كنت اتبعه اتباع الفصيل اثر امه يرفع لي كل يوم من اخلاقه علما!

میں آپ کے پیچھے پیچھے چلتا تھا اُس طرح جیسے ناقہ کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ آپ ہر دن میرے لیے اپنے اخلاق سے ایک منارۂ نور بلند کرتے تھے۔

اس ذیل میں کہا ہے۔

كنت ارى نور النبوة واشم ريح الرسالة

میں نبوت کی روشنی اپنی آنکھ سے دیکھتا تھا اور رسالت کی خوشبو سونگھتا تھا"

(نہج البلاغہ (ج ۲ صفحہ ۱۸۳ طبع مصر)

ڈاکٹر اقبال کی لفظوں میں ؎

مسلم اول شہِ مرداں علیؑ   عشق را سرمایۂ ایماں علیؑ

قدیم ترین مورخ ابن اسحٰق نے جو ترتیب بتائی ہے وہ یہ ہے کہ جناب خدیجہ بنت خویلد سب سے پہلی ایمان کا اقرار کرنے والی فرد ہیں اور صنفِ ذکور میں سب سے پہلے جنہوں نے ایمان کا اعلان کیا وہ علی بن ابی طالب تھے۔ پھر رسولؐ کے ساتھ مثل اولاد کے رہنے والے اور آپ کے بیٹے کہے جانے والے زید بن حارثہ تھے کہ یہ بھی گھر والوں میں

محسوب تھے۔ ان کے علاوہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے پتہ چلتا ہے جو درایت کے مطابق ہے کہ اسی دور میں جناب علی بن ابی طالب کے ایک دوسرے بھائی حضرت جعفر بھی جنھیں ایک حدیث حضرت رسولؐ کی بنا پر جعفر طیارؒ کہا جاتا ہے اس فہرست میں داخل ہو چکے تھے: چنانچہ شروع میں جو نمازیں ہوتی تھیں ان میں رسولؐ کے پیچھے جو صف قائم ہوتی تھی وہ حسب ذیل افراد پر مشتمل ہوا کرتی تھی۔

(۱) علیؑ (۲) جعفرؓ (۳) زیدؓ (۴) خدیجہؓ

(اعلام الوری)

اس کے بعد جو اِکّا دُکّا آدمی دوستانہ حیثیت سے گھر پر آجایا کرتے تھے ان کے سامنے ذکر آیا تو ان میں ایک قول کے مطابق سب سے پہلے قبیلۂ بنی تیم میں سے جناب ابوبکر نے اسلام قبول کیا۔ اور پھر عثمان۔ زبیر بن العوام۔ عبدالرحمٰن بن عوف۔ سعد بن ابی وقاص اور طلحہ بن عبید اللہ کچھ دنوں کے اندر مسلمان ہوئے (ابن ہشام ج ۱ ص ۱۵۳/۱۵۴) مگر دوسری روایت میں جسے طبری نے محمد بن سعید کی زبانی نقل کیا ہے یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے والد سے پوچھا کہ آپ لوگوں میں ابوبکر سب سے پہلے اسلام لائے؟ اُنھوں نے کہا نہیں! اُن سے قبل پچاس آدمی سے زیادہ اسلام لا چکے تھے۔

تقیہ پر عمل

آغاز رسالت سے تین برس تک قانون تقیہ پر عملدر آمد رہا اور دعوتِ اسلامی کا کام مخفی طریقہ پر انجام پاتا رہا۔ ابن سعد کے الفاظ ہیں۔

کان بین عواول ما نزلت علیہ النبوۃ ثلث سنین مستخفیا الی ان امر بظہور الدعآء	وحی الٰہی نازل ہونے کے بعد شروع شروع تین برس تک حضرت خفیہ تبلیغ فرماتے رہے یہاں تک کہ حکم الٰہی اظہار نبوت کا آیا۔
(طبقات صفحہ ۱۳۲)	

ابو الفداء وغیرہ کے بھی یہی الفاظ ہیں۔

شیخ عبد الحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:۔

"تا سہ سال حال بر ایں منوال بود و مامور بود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باخفائے ایں امر وصبر برآں پس آنحضرت بخفیہ دعوت می کرد نازل شد ایں آیہ کریمہ فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشرکین۔

(مدارج النبوۃ)

مسٹر کے اے حمید بی اے (لنڈن) بیرسٹر لاہور نے لکھا ہے:۔

"ابتدا میں حضورؐ پر معدودے چند لوگوں کے بجز عوام

ایمان نہ لائے۔ اشاعت مذہب کی رفتار بالکل سست تھی۔ چار سال کے بعد مسلمانوں کی تعداد صرف انتالیس افراد تھی۔ مسلمان عوام کے ڈر سے گھروں میں کواڑ بند کر کے قرآن کے آیات کی تلاوت کرتے اور اپنے مذہبی فرائض انجام دیتے تھے۔ چار سال کی عسرت و تنگی کے بعد سرکار نے علی الاعلان کعبہ کے سامنے توحید کا پرچار کیا۔"

(مسلمانان عالم جلد ۱ صفحہ ۴۰)

تین سال کو چار سال بنانا اور پھر درمیان کی منزلوں کو چھوڑ کر علی الاعلان کعبہ کے سامنے پرچار تک پہونچا دینا۔ اس مصنف کی وہ روا روی اور غفلت ہے جس کی ارادی تحریفوں اور ادبی بدتمیزیوں کے علاوہ اس کی اس تاریخ میں شدت کے ساتھ کثرت پائی جاتی ہے جس پر کہیں کہیں جہاں ضرورت محسوس ہوئی اس کتاب میں تنبیہ کی جائے گی۔

ایک محدود مجمع میں پہلی علانیہ تبلیغ

دعوت عشیرہ

گھر کے بعد قدرۃً گھرانے کی باری آنا ہی چاہیے تھی اور گھرانے کے بعد عوام کی۔ رسولؐ کا پیغام گھر والوں کو تو اپنا بنا ہی چکا تھا۔

اب تین برس تک رازداری کے ساتھ فرضِ تبلیغ ادا ہونے کے بعد یہ حکم آیا۔

وانذر عشیرتک الاقربین   اپنے قریبی رشتہ داروں کو تبلیغ کیجیے

شعراء آیت ۲۱۴)

یہ گھرانے کی تبلیغ کا فرمان تھا جس کے بغیر عوام کو تبلیغ کی آیت نہیں آسکتی تھی۔ اس حکم کی تعمیل میں دعوت کا انتظام کیا گیا۔ پہلے دن سب جمع ہوئے کھانا کھایا مگر حضرت کو کچھ کہنے کا موقع نہ دیا۔ دوسرے دن آپ نے پھر دعوت کی اور تمام اولادِ عبدالمطلب کو جمع کر کے اپنی رسالت کا اعلان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ "میں تمھارے پاس دنیا و آخرت کی نیکی لایا ہوں اور اللہ نے مجھے اس پر مامور کیا ہے کہ تمھیں اُس کی طرف بلاؤں"۔ پھر فرمایا کہ "تم میں کون شخص اس دین کی اشاعت میں میرا دست و بازو بننے کے لیے تیار ہے اور وہی میرا بھائی میرا وصی اور میرا جانشین قرار پائے گا"۔

اس اعلان سے یہ ظاہر تھا کہ آئینِ اسلام میں رسولؐ کی جانشینی میں عوام کی رائے کو دخل نہیں ہے بلکہ وہ خدا و رسول کے اختیارِ تمیزی سے متعلق ہے جس کے لیے اُس وقت بطور علامت اس وقت کے عہدِ نصرت و وفاداری اور اُس کی تکمیل کو قرار دیا گیا تھا۔

مجمع تمام خاموش رہا اور صرف حضرتِ علی بن ابی طالبؑ تھے جو

اگرچہ سب سے زیادہ کم سن تھے مگر کھڑے ہو گئے اور کہا میں آپ کا اس مہم میں ہر طرح سے مددگار رہوں گا۔ حضرت رسول خداؐ نے علیؑ کے کاندھے پہ ہاتھ رکھا اور فرمایا بس یہ میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین ہے۔ تم سب کو اس کی اطاعت لازم ہے۔

(طبری ج ۲ صفحہ ۲۱۷)

یہ واقعہ اتنا مسلم ہے کہ تاریخ کے علاوہ حدیث کا جزو بھی بن گیا ہے اور تفسیر کا بھی ـــ ملاحظہ ہو تواریخ میں علاوہ طبری کے ابن اثیر اور ابوالفدا اور تفاسیر میں معالم التنزیل بغوی، تفسیر خازن بغدادی اور جمع الجوامع سیوطی وغیرہ اور جوامع حدیث میں کنز العمال ملا علی متقی اور سیر میں دلائل النبوۃ بیہقی وغیرہ۔

اس کے علاوہ انگریزی مورخین نے بھی بڑے مؤثر الفاظ میں اُسے اپنی تاریخوں میں درج کیا ہے۔

فاضل ہم عصر مولوی امام الدین صاحب ام نگری اپنے مقالہ "رسالت محمدی کا تحقیقی ثبوت" میں جو سوکوی دہلی کے ستمبر سنہ ۱۹۵۹ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے لکھتے ہیں کہ:-

"حضرت علی کے علاوہ جو کمسن بھی تھے اور پہلے سے مسلمان بھی کسی نے خدا کے رسول کی پیش کش کا جواب نہ دیا۔ حضرت علی نے کھڑے ہو کر فریضۂ تائید ادا کیا تو تمام اکابر ان کی تائید کو ایک طفلانہ حرکت

سمجھ کر ہنس پڑے لیکن آنے والے حالات نے بتایا کہ خدا کا رسول بھی سچا تھا، اس کی دعوت بھی سچی تھی اور وہ مرد حق بھی سچا تھا جس نے تنہا اس کی تائید کی تھی"

(مولوی ستمبر ۵۹ء ص ۱۰)

مجمع عام میں پہلی تبلیغ

جب اس محدود مجمع میں تبلیغ کا مرحلہ طے ہو گیا تو اب حکم آیا کہ

فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشرکین۔

"آپ جس دعوت پر مامور کیے گئے ہیں اُسے برملا پیش کیجیے اور مشرکین کی طرف کچھ اعتنا، نہ کیجیے"

اب ایک دن جب کعبہ کے سامنے دور تک مشرکین اکٹھا تھے آپ کوہ صفا پر تشریف لے گئے اور حد نظر تک کے لوگوں کو پکار کر مخاطب کیا اور کہا "بتاؤ کہ اگر میں تم لوگوں کو اطلاع دوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے غنیم کا لشکر حملہ کے لیے آ رہا ہے تو تم میرے کہنے سے اُسے باور کرو گے یا نہیں؟"

اس سوال پر سامنے کے لوگوں میں سے بہت سی آوازیں بلند ہوئیں کہ ضرور باور کریں گے اس لیے کہ اس زبان سے ہم نے سوا سچ کے

کبھی جھوٹ سُنا ہی نہیں ہے۔ جب آپ نے یہ اقرار لے لیا تو فرمایا کہ اچھا پھر سنو کہ مجھے اللہ نے اپنا رسول بنایا ہے اور مجھے اس پر مامور کیا ہے کہ میں تمھیں ہدایت کردوں اور بتلاؤں کہ یہ جو تم بُت پرستی کرتے ہو اور بداعمالیوں میں مبتلا ہو اس کے نتیجہ میں آتش جہنم کے شعلے ہیں۔

اب یہ پوری زندگی کے انقلاب کا پیغام تھا اس لیے لوگ ہنسنے اور قہقہہ لگانے لگے اور طرح طرح کی چہ می گوئیاں کرنے لگے۔

آپ اپنی بات کہہ کر پہاڑ سے نیچے اُتر آئے مگر آج سے آپ کے اور مشرکین کے درمیان حق اور باطل کے مقابلہ کی کشمکش شروع ہو گئی جس میں آپ کو سخت مشکلات سے دوچار ہونا پڑا جن کا بیان آئندہ نذر ناظرین ہوگا۔

اسلام کا پیغام انقلاب

اور

مخالف طاقتوں سے تصادم

چونکہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم عرب میں پیدا ہوئے تھے اور ابتدائی مخاطب آپ کے زیادہ تر عرب ہوئے اس لیے تاریخ اسلام میں تاریخ عرب اور اُن کے ماضی حال کی کیفیت کو خاص اہمیت حاصل ہے اور چونکہ آپ کا پیغام خاص عربوں کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لیے آیا تھا اس لیے تمام دنیا کے حالات پر بھی نظر ڈالنا ہوگی کہ اُس وقت تمام دنیا کی کیا کیفیت تھی؟

جہاں تک عرب کے حالات کا تعلق ہے جیسا کہ ہمارے بزرگ دوست خواجہ محمد لطیف صاحب انصاری نے "اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ" جلد اول (نشر کردہ رضا کار بک ڈپو۔ لاہور) میں لکھا ہے "اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کے مطالعہ سے پہلے اس سرزمین کے جغرافیائی حالات کا جاننا نہایت ضروری ہے کیونکہ جغرافیہ کا تاریخ پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

حدود اربعہ :۔ عرب کے شمال میں صحرائے شام ہے، مشرق میں

خلیج فارس اور خلیج عمّان ہیں۔ جنوب میں بحیرۂ عرب اور مغرب میں بحیرہ قلزم یا بحیرۂ احمر (RED SEA) واقع ہیں۔ اس کے تین طرف سمندر ہیں اور جانب شمال خشکی یعنی شام کا ملک ہے۔ عرب کا صحرائی ملک براعظم ایشیا کا ایک جزیرہ نما ہے جو دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ نما اور وسعت میں فرانس سے دُگنا ہے۔ عرب کے باشندے اُسے "جزیرۃ العرب" کہتے ہیں۔ حقیقت میں یہ جزیرہ نہیں بلکہ جزیرہ نما ہے مگر عملی طور پر یہ جزیرہ ہی ہے۔ چونکہ اس کے شمال میں نفود کا نہایت گرم صحرا ہے۔"

اس سے زیادہ جغرافیائی تفصیلات ہمارے نزدیک اصل موضوع کے لحاظ سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔

وہ دور جس سے بعثت رسولؐ سے قبل عرب گذر رہے تھے "زمانہ جاہلیت" کہلاتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے "شہید انسانیت" میں تفصیل سے لکھا ہے، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عرب لوگ جنگلی قبائل کی طرح تہذیب و تمدن سے بالکل اجنبی تھے اور دورِ وحشت میں زندگی گذار رہے تھے بلکہ عرب کی جاہلیت کا زمانہ علم و تمدن و تہذیب کے بعد والے تنزّل کا دور تھا جس میں عقل کے پہلے چراغ بجھ گئے تھے اور بُری عادتوں نے اُن پر غلبہ کر لیا تھا۔

یہی وہ صورتِ حال ہے جس کی اصلاح مشکل ہوتی ہے اس لیے کہ وحشی قبائل وغیرہ کی فطرت کا ورق تو سادہ ہوتا ہے۔ وہاں اصلاح

کے نقش کو آسانی سے قبول کرلیتا ہے مگر اس طرح کی جاہلیت وہ ہوتی ہے جس میں بری عادتوں کو انسان کچھ اچھے تصورات کا لباس پہنا کر اختیار کرتا ہے اور اُن برائیوں پر شرمندہ ہونے کے بجائے اُن پر نازاں ہوتا ہے جس طرح یورپ کا یہ دورِ تمدّن ہے جس میں ہر قسم کی خوں ریزی و خون آشامی بنام قیام امن ہوتی ہے اور بداخلاقی کی اشاعت کلچر کے نام پر ہوتی ہے۔ یہی صورت عرب کی تھی۔ وہ بُت پرستی سادگی کے ساتھ نہ کرتے تھے یہ تصور کرکے کہ یہی اصنام ہماری ضرورتوں کو پورا کرنے والے ہیں بلکہ وہ اس کا فلسفہ بیان کرتے تھے وہی جو آج چودہ سو برس بعد انتہائی روشن خیالی کے بعد بھی بُت پرستی کی معقولیت میں پیش کیا جاتا ہے کہ مَا نَعبُدُ هُم الا لیقرّبونا الی اللہ زلفیٰ یعنے یہ ان کی پرستش معبودِ حقیقی کی طرف توجہ حاصل کرنے کے لیے ہے۔ شراب خواری اور قماربازی کو وہ فیاضی کی دلیل سمجھتے تھے۔ لڑکیوں کے زندہ درگور کرنے کی ایسی قبیح رسم تک کو وہ غیرت و شرافت کے احساس کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔ دوسرے پر ظلم کرنے کو وہ بہادری سمجھتے تھے اور حلم و عفو کو بزدلی قرار دیتے تھے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی جاہلیت خالص جہالت نہیں بلکہ "جہل مرکب" کی حیثیت رکھتی تھی جسے علمائے اخلاق نے لاعلاج مرض کہہ کر اس کی اصلاح میں اپنی عاجزی کا اعتراف کیا ہے۔

احساسِ برتری نے ان میں قومی خودداری ایسی ضرور پیدا کی تھی کہ کسی دوسری قوم کے اقتدار کے سامنے سر خم کرنا اُن کے لیے مشکل تھا مگر اس خودداری نے قومیت سے آگے بڑھ کر قبیلوں کے افراد میں بھی انانیت پیدا کر دی تھی جس کا نتیجہ تھا باہمی رقابت اور آپس کی خانہ جنگی اور پھر اس میں طبقہ واری برتری نے پیدا ہو کر مساواتِ انسانی کا خاتمہ کر دیا تھا اور اونچ نیچ کا تصور پیدا کر کے وحدتِ انسانی کے پرخچے اُڑوا دیے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک بڑے آدمی کے قتل ہو جانے پر صرف اس کے قاتل کو قتل نہ کیا جاتا تھا بلکہ اُس کے قبیلے کے سیکڑوں بے گناہ آدمیوں کو مار ڈالا جاتا تب کہیں یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کے خون کا بدلا ہوا۔ اس کے برخلاف اگر بڑے آدمی کے ہاتھ سے کوئی چھوٹا آدمی قتل ہوتا تھا تو اُس کا خون قصاص کا مستحق سمجھا نہ جاتا تھا۔

مذہبی حیثیت سے وہ نہایت پستی میں تھے۔ اُن میں کوئی ایک مذہب مشترک نہ تھا بلکہ بڑی جماعت بُت پرستی میں مبتلا تھی چنانچہ خانۂ کعبہ جو کہ حضرت ابراہیمؑ نے خدائے واحد کی عبادت کے لیے بنایا تھا اُن کے ہاتھوں ایک بُت خانہ کی شکل اختیار کر چکا تھا جس میں اُن کے سال کے دنوں کے لحاظ سے تین سو ساٹھ بُت رکھے ہوئے تھے کہ ایک ایک دن ہر بُت کی عبادت کی جائے۔

کچھ لوگ صابئین یعنی ستارہ پرست تھے۔ ان کے علاوہ کچھ یہود
مجوس اور نصرانی بھی تھے مگر یہ سب نام کے لحاظ سے نہ سہی حقیقت
کے لحاظ سے مشرک بن گمر... چکے تھے۔ یہود عزیر کو
خدا کا بیٹا کہہ رہے تھے اور عیسائی مسیح کو خدا کا بیٹا کہنے کے علاوہ
تثلیث کا گورکھ دھندا بنا کر ایک کے بجائے باپ بیٹے اور روح القدس
تین تین کی پرستش کرنے لگے تھے۔ اس طرح نہ یہود موسیٰ کے تعلیمات
پر قائم تھے اور نہ نصاریٰ حضرت مسیح کی تعلیم پر۔ اور مجوس کے لیے تو یہی
بات مشکوک ہے کہ وہ دراصل کسی سچے پیغمبر کی طرف نسبت بھی رکھتے تھے
یا نہیں۔ اور اب تو ان کے بنیادی عقائد میں شرک یعنی یزداں و اہرمن
دو خداؤں کا عقیدہ موجود تھا۔ اس کے علاوہ کچھ منکر خدا یعنی دہریے
بھی موجود تھے جو ما یہلکنا الا الدہر کے نعرے لگا رہے تھے
جنھیں اصطلاح حال میں نیچری کہنا چاہیے۔

اس تمام اکثری بلکہ ہمہ گیر ضلالت کی تاریکی میں معدودے چند
آل ابراہیم یعنی اسلاف حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ تھے
جو توحید اور صحیح اخلاق کی امانت کو سینہ سے لگائے بیٹھے تھے مگر ان کی کوئی
آواز نہ تھی اور وہ اوصاف ان کی انفرادی شخصیتوں میں محدود ہو کر
رہ گئے تھے۔

جو حالت عرب کی تھی یہی تقریباً تمام دنیا کی تھی۔

مادی حیثیت سے دو شہنشاہیتیں اُس وقت با اقتدار تھیں۔ ایک سلطنت روم جس کے تحت میں عرب کا شام کا علاقہ چلا گیا تھا اور دوسرے سلطنت فارس جس کے قبضہ میں عراق آ گیا تھا۔ رومی سلطنت کا مذہب عیسائی تھا مگر وہ عرصۂ دراز سے علم و حکمت کے چراغ کو گل کر کے اعتقاد کو عقل کے ماورا قرار دے چکا تھا اور یونانی مفکرین کا قلع قمع کر کے ایمان کو ,,تقلید کورانہ،، کا مرادف قرار دیے ہوئے تھا۔ ایران زردشتی مذہب کا پیرو ہو کر آگ کی پرستش میں گرفتار تھا اور خدا پرستی سے بے نصیب ہو چکا تھا۔ تمدنی حیثیت سے دونوں پر مادیت مسلط تھی اور عیش و عشرت کی گرم بازاری نے اخلاق و فرائض کو زینت طاق نسیاں بنا رکھا تھا۔ اس طرح دونوں ملک خود غرضیوں اور ستم رانیوں کا مرکز بنے ہوئے تھے جو تمدن و تہذیب کے زوال کی علامت ہیں۔

یورپ تو اُس وقت کوئی قابل ذکر حیثیت ہی نہیں رکھتا تھا بلکہ وہ اس وقت دورِ وحشت سے گزر رہا تھا اور تمدن سے دور تھا اور ہندوستان بھی اپنے ابتدائی رہبروں کی توحید کی تعلیم کو فراموش کر کے مشرکانہ ظلمت میں گرفتار تھا اور اپنے قدیم باشندوں پر بیرونی آریائی حملہ آوروں کی سیاسی اقتدار پسندی کی بدولت اس اونچ نیچ اور ذات پات کی تفریق میں مبتلا ہو چکا تھا جس سے نکلنے کے لیے وہ اب تک ہاتھ پاؤں مار رہا ہے مگر اُس کی گرفت اتنی مضبوط ہو چکی ہے کہ عملی طور پر اس سے نکلنے میں کامیابی نہیں ہو رہی ہے۔

اس عالمِ ظلمات میں حضرت محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا کے لیے مشعلِ نور لے کر کھڑے ہوئے۔ آپ نے اپنے پیغام میں شروع ہی سے جب خطاب کیا تو ایتہا العرب ”اے قوم عرب“ نہیں کہا۔ بلکہ ایّھا الناس کہا ”اے انسانو“ بلکہ پہلی ہی وحی میں خالق نے ان کی زبانی جو اللہ کا احسان یاد دلایا اس میں عرب کا نام نہیں لیا بلکہ انسان کا نام لیا۔ یاد کر لیجیے اُس وحی کو:۔ اقرأ باسم ربك الذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقرأ وربك الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم۔ اس طرح اُن کے پیغام کا پرچم شروع سے قبائلی اور قومی حدبندیوں سے آزاد ہو کر آفاقی سطح پر فضائے انسانیت میں بلند ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ اُس پیغام کے سُننے والوں کا دائرہ تدریجی طور پر آگے بڑھا۔ ابتدا میں اُس کے سُننے والے عرب تھے اور اہل مکہ جو زیادہ تر مشرکین یعنی بت پرست تھے اور پھر مدینہ والے ہوئے جن میں بہت سے یہودی بھی تھے اور پھر یمن تک آواز پہنچی جہاں عیسائی رہتے تھے اور پھر وفود اور خطوط کے ذریعے روم اور فارس اور مصر اور حبش وغیرہ تک پیغام پہنچایا گیا جس کی تفصیل انشاء اللہ آئندہ اجزائے کتاب میں آئے گی۔

بہرحال چونکہ ابتدائی مخاطبین کا حلقہ آپ کا عربوں ہی کا تھا اس لیے آپ کی انقلابی مہم میں رکاوٹیں ڈالنے کے لیے جو کھڑے ہوئے وہ بھی وہی تھے جن میں بھی قریش یعنی وہی قبیلہ جس میں آپ پیدا ہوئے تھے

آگے آگے تھا اس لیے کہ آپ کا پیغام بہت سی اُن کی عادتوں ہی سے نہیں بلکہ اُن کے نظریات سے بھی متصادم تھا۔

ڈاکٹر وحید مرزا صاحب سابق صدر شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی کی لفظوں میں :۔

> "رسول اُن لوگوں کو بردباری، خاکساری، پاکبازی اور عفو کا سبق پڑھا رہے تھے جن کے نزدیک معاف کر دینا کمزوری کی دلیل اور انتقام نہ لینا ذلت اور بزدلی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ رسولؐ اُن لوگوں کو مساوات اور اخوت کی تعلیم دینا چاہتے تھے جو کہ اپنی خاندانی شرافت پر فخر کیا کرتے تھے اور اپنے آباؤ اجداد کے پورے شجرہ کو نہایت سختی کے ساتھ محفوظ رکھا کرتے تھے۔ ان چیزوں کے علاوہ اسلام کو عربوں کے اور بہت سے دوسرے رجحانات سے برسرِ پیکار ہونا پڑا۔ عرب اس بات کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ سب سے زیادہ مقدس انسان کیونکر خدا کی بارگاہ میں سب سے زیادہ معزز ہو سکتا ہے یا اسلام قبول کرنے کے بعد کوئی پست انسان کیونکر عرب کے شریف ترین خاندانوں کے اشخاص سے برتری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔"

یہ ایک پورا تمدنی انقلاب۔ معاشرتی انقلاب۔ سیاسی انقلاب اور معاشی انقلاب تھا جو ایک مختصر جملہ لا الٰہ الا اللہ میں مضمر تھا جس کی طرف رسولؐ دنیا کو دعوت دے رہے تھے اور عرب۔ سادہ لوح جاہل یعنی وہی دورِ وحشت سے گزرنے والا گروہ ہوتا تو وہ اس جملہ کو واقعی ایک

سادہ سا جملہ سمجھ کے برداشت کرلیتا، مگر عرب باوجود اپنی جہالت کے بڑا نکتہ رس تھا کہ وہ اس سادہ سے جملے کے مضمرات کو بڑی حد تک پہلی ہی آواز پر سمجھ گیا اس لیے وہ اپنے معبودانِ باطل کے تحفظ کے لیے جو فقط سونے، چاندی، پتھر کے بُت نہ تھے بلکہ اپنے تشخص و اقتدار، اپنے اوہام و تصوّرات اور اپنے رسوم و عادات کے بھی اصنام تھے۔ کھڑا ہو گیا اور ایک اکیلے پیغمبر خدا کے سامنے پوری قوم صف بستہ ہو کر آ گئی۔

خصوصیت کے ساتھ بنی اُمیہ جو خود رسولؐ سے موروثی عداوت رکھتے تھے۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں :-

" آنحضرتؐ کی نبوت کو خاندان بنی اُمیہ اپنے رقیب (ہاشم) کی فتح خیال کرتا تھا اس لیے سب سے زیادہ اسی قبیلہ نے آنحضرتؐ کی مخالفت کی۔"

(سیرۃ النبی جلد اول ص۱۵۸)

ان کے علاوہ بنی مغیرہ اور بنی مخزوم۔ ان میں ابوجہل کا چچا ولید بن مغیرہ جو خالد بن ولید کا باپ تھا بہت پیش پیش تھا۔ خود رسولؐ فرماتے تھے کہ :-

" ہم سے سب سے زیادہ بغض و عداوت رکھنے والی قومیں بنو اُمیہ، بنو مغیرہ اور بنی مخزوم ہیں۔"

(تطہیر الجنان۔ ابن حجر مکی ص۱۴۲)

جناب ابوطالب سے گفت و شنید

مشرکین اب کسی نہ کسی طرح پیغمبر خداؐ کی زبان بندی کرنا چاہتے تھے اس کے لیے اُن میں کے جہاں دیدہ افراد نے پہلے پُرامن ذرائع اختیار کرنا مناسب سمجھے۔ اس کے لیے اُن کو پہلے سب سے اچھا ذریعہ یہ معلوم ہوا کہ جناب ابوطالب سے کام نکالا جائے۔ ظاہر ہے کہ اُن میں کے بہت سے بڑے لوگوں کا جناب ابوطالب سے بچپن کا دوستانہ تھا بہت سے لوگوں کے اُن سے تجارتی تعلقات تھے اور قرابتی سلسلہ نزدیک یا دُور کا تقریباً ان سب ہی سے تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس ساری دنیا میں حضرت محمد مصطفیٰؐ کا سہارا سوا ان کے کوئی نہیں ہے اس لیے ناممکن ہے کہ اُن کی بات کا اُن پر اثر نہ ہو۔ اس لیے یا تو ان کے سمجھانے سے وہ مان جائیں گے اور جو مہم اُنھوں نے شروع کی ہے اُسے ترک کر دیں گے تو جو مطلب ہے وہ حاصل ہی ہو جائے گا اور یا وہ انکار کر دیں گے اور اپنی روش پر قائم رہیں گے تو جناب ابوطالب کی ہمدردی اُن سے سلب ہو جائے گی اور ان کے ساتھ ساتھ تمام بنی ہاشم جو حضرت ابوطالب کے زیر اثر ہیں وہ بھی کنارہ کشی اختیار کر لیں گے۔ اس طرح محمدؐ اکیلے رہ جائیں گے اور پھر اُن کے خلاف جو بھی مناسب سمجھا جائے وہ رویّہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ یہ سوچ کر اُن کا ایک وفد جناب ابوطالب کے پاس آیا۔

جہاں تک ہم نے غور کیا ہے یہاں پر اکثر مؤرخین نے کئی مرتبہ کی

گفتگوؤں کو یکجا کر کے بیان کر دیا ہے۔ یہ سب باتیں ایک دفعہ نہیں بلکہ مختلف دفعات میں ترتیب کے ساتھ ہوئی ہوں گی۔

پہلی دفعہ اُنھوں نے ملائم انداز میں کہا۔—

انت سیدنا وافضلنا فی انفسنا وقد رأیت الذی فعل ھؤلاء السفہاء مع ابن اخیك من ترکھم آلھتنا وطعنھم علینا وتسفیھھم احلامنا۔

(طبقات ابن سعد جلد ۱ صفحہ ۱۳۴)

آپ ہمارے سردار ہیں اور ہم سب آپ کو اپنے میں سب سے بہتر جانتے ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان بیوقوفوں نے آپ کے بھتیجے کو اپنے ساتھ ملا کر کیا کر رکھا ہے کہ انھوں نے ہمارے خداؤں کو چھوڑ دیا ہے، ہم پر اعتراض کرتے ہیں اور ہمیں احمق بنا رہے ہیں۔

اس وقت مطلب اتنا ہی ہو گا کہ آپ اپنے بھتیجے کو سمجھائیے کہ وہ ایسا نہ کریں اور اس سے باز آ جائیں اور اس وقت جناب ابوطالب نے بھی دفع الوقتی والا کوئی جواب دے دیا ہو گا جس کے بعد وہ نتیجہ کے منتظر ہو گئے ہوں گے کہ دیکھیں اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب اُنھوں نے دیکھا کہ کوئی اثر نہیں ہوا اور جناب رسالت مآبؐ کے رویّے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تو اس کے بعد اُنھیں آپ کی طرف سے مایوسی ہو گئی کہ ان کی اصلاح ممکن نہیں ہے اور اس کے ساتھ اپنی جگہ یہ زعم ناقص اُنھیں پیدا ہوا کہ یقیناً اب ابوطالب اپنے بھتیجے سے کچھ بددل ضرور ہو گئے ہوں گے کہ اُنھوں نے اُن کی فہمائش پر عمل نہیں کیا مگر اُنھوں نے

محمدؐ کو مثل اولاد کے پالا ہے اور پالنے کی محبت بہت ہوتی ہے لہذا اگر انھیں ان کا کوئی نعم البدل دے دیا جائے تو شاید وہ تیار ہو جائیں کہ محمدؐ کو ہمارے سپرد کر دیں کہ ہم اُن کے ساتھ جو چاہیں سلوک کریں۔ یہ سوچ کر انھوں نے ولید بن مغیرہ کے بیٹے عمارہ کو جو بڑا حسین و شکیل جوان تھا لا کر جناب ابوطالب کے سامنے پیش کیا اور کہا:۔

قد جئناك بفتى قريش
جمالا و نسبا و نهادة
و شعرا ندفعه فيكون لك
نصره و ميراثه و تدفع
الينا ابن اخيك نقتله
فان ذلك اجمع للعشيرة
و افضل فى عواقب الامور
مغبة۔

ہم آپ کے پاس قریش کے اس جوان
کو لے کر آئے ہیں جو حسن و جمال،
خاندانی شرافت، قدوقامت اور
گیسو و رُخ میں فرد فرید ہے۔ اسے
آپ لے لیجیے۔ یہ آپ کا مددگار رہے گا
اور اس کی میراث کے بھی آپ حقدار
ہوں گے، اور اپنے بھتیجے کو ہمیں دے دیجیے
ہم اُسے قتل کر ڈالیں کہ نظم قبیلہ اسی
صورت سے درست ہو سکتا ہے اور نتائج
کے لحاظ سے یہ صورت نہایت مناسب ہے۔

جناب ابوطالب نے اس کا انتہائی پیارا اور مسکت جواب دیا، کہا:۔

"واہ! سبحان اللہ! کیا خوب، تم لوگوں نے میرے ساتھ انصاف کیا ہے! یعنی میں تو تمہارے بچے کو لے کر پالوں اور اُسے کھلاؤں پلاؤں اور تم میرے بچے کو مجھ سے لے کر قتل کر ڈالو! یہ انصاف تو

نہ ہوا ۔ ہاں طاقت کے بل پر کسی کمزور کو دبانا ہوا الخ

(ابن سعد جلد ۱ ص ۱۳۴)

اس جواب کو سن کر وہ جناب ابو طالبؑ کی طرف سے بھی مایوس ہو گئے اور سمجھ گئے کہ ان میں اپنے بھتیجے کی طرف سے کوئی بد دلی پیدا نہیں ہوئی ہے اور یہی وہ منزل ہو سکتی ہے جس کے بعد جناب ابو طالب کو رسولؐ کی زندگی سے متعلق خطرہ محسوس ہونے لگا اور اس احساس میں اتنی شدت ہوئی کہ ایک شام کو اُنھوں نے رسالتمآبؐ کو گھر پر نہیں پایا تو فقط تردد نہیں ہوا بلکہ جیسے یقین ہو گیا کہ رسولؐ کو کچھ گزند پہونچا دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے اولاد ہاشم و مطلب سے کچھ جوانوں کو جمع کر کے اُنھیں ہدایت کی کہ ہر ایک تم میں سے کوئی کاٹ دار لوہے کا ہتھیار ہاتھ میں لے لے اور جب میں مسجد میں داخل ہوں تو تم میں سے ایک ایک آدمی ان میں کے ایک ایک بڑے لیڈر کے پہلو سے پہلو ملا کر بیٹھ جائے اور خصوصیت کے ساتھ ابوجہل کو نہ چھوڑنا اور جونہی یہ معلوم ہو کہ محمدؐ قتل ہو گئے فوراً ہر ایک تم میں کا اپنے پاس والے کا خاتمہ کر دے پھر اس کے بعد دیکھا جائے گا۔

سب نے اقرار کیا کہ اطمینان رکھیے ایسا ہی ہو گا۔ اتنی دیر میں جناب زید بن حارثہ نظر آ گئے۔ اُن پر نظر پڑتے ہی آپ نے پوچھا، ارے تم نے میرے بچے کو دیکھا ہے؟ اُنھوں نے کہا، جی ہاں ابھی تو میں اُن کے ساتھ تھا۔

جناب ابوطالبؓ کے جذبات کی شدت اس حد پر تھی کہ کہا میں گھر کے اندر جاؤں گا نہیں جب تک اپنی آنکھ سے اُسے نہ دیکھ لوں ۔

زیدؓ تیزی کے ساتھ رسول خداؐ کے پاس گئے ۔ اُس وقت آپ کوہ صفا کے پاس تشریف فرما تھے اور آپ کے اصحاب کہ جو اسلام قبول کر چکے تھے آپ کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے ۔ زید نے پہنچ کر جلدی جلدی واقعہ کو سنایا جسے سن کر فوراً پیغمبر خداؐ اُٹھے اور جناب ابو طالبؓ کے پاس آئے ۔ اُنھوں نے کہا "بیٹا کہاں تھے ؟ خیریت سے تو تھے ؟" حضرتؐ نے فرمایا "جی ہاں، خیریت سے تھا ۔" کہا "اچھا ، بس اندر جاؤ ، گھر میں بیٹھو ۔"

ظاہر ہے کہ اتنا ہی واقعہ جناب ابو طالبؓ کے عزم و ہمت کے اظہار کے لیے کافی تھا اور نفسیاتی طور پر اُس سے خود پیغمبر خداؐ کو تسلی ڈھارس بندھ سکتی تھی اور چچا کی وفاداری پر اعتماد پیدا ہو سکتا تھا وہ بھی ظاہر ہے ، مگر اس پیرانہ سال ، مردِ خدا کی جوان مردانہ ہمت کی انتہا یہ ہے کہ اس واقعہ کو اتنے پر ہی ختم نہیں ہونے دیا بلکہ جب صبح ہوئی تو اُنھوں نے پیغمبر خداؐ کا ہاتھ پکڑا اور اُن سب ہاشمی و مطلبی جوانوں کے ساتھ ساتھ اُنھیں لیے ہوئے اُس جگہ آئے جہاں تمام بزرگان قریش جمع تھے اور کہا "اے قریش والو! جانتے ہو میں نے رات کو کیا منصوبہ بنا لیا تھا ؟" اُنھوں نے کہا "نہیں ہمیں نہیں معلوم ۔" کہا "اچھا تو سن لو ۔" پورا واقعہ بیان کر دیا اور اپنے ساتھ والوں سے کہا کہ تم ہاتھ میں جو ہتھیار

لیے ہوئے تھے وہ بھی دکھلا دو۔ سب نے دیکھا کہ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک مہلک ہتھیار تھا۔ جناب ابو طالبؑ نے کہا ”خدا کی قسم اگر محمدؐ کا بال بیکا ہوا ہوتا تو میں تم میں سے کسی ایک کو چھوڑتا نہیں۔ پھر ہم تم سب ہی ختم ہو جاتے۔“

تمام مجمع پر ایک سناٹا چھا گیا اور ابو طالبؑ رسولؐ کو لے کر واپس گئے۔ تاریخ کا بیان ہے:-

فانکسر القوم وکان	پوری قوم پر ایک شکستگی طاری
اشدهم انکسارا ابوجهل	ہو گئی اور سب سے زیادہ شکستہ دلی کا اثر
(ابن سعد جلد ۱ ص ۱۳۶)	ابوجہل پر تھا۔

اس کے کچھ عرصہ تک مشرکین نے پھر بے چینی کے ساتھ صورت حال پر غور کیا ہو گا۔ محمدؐ مانتے نہیں۔ ابو طالب انھیں چھوڑتے نہیں۔ اب کیا ہو؟ اس کے بعد کی یہ منزل ہو گی کہ انھوں نے طے کیا ہو گا کہ پھر ابو طالب سے بھی نپٹ ہی لیا جائے، مگر سوچا ہو گا کہ ایک دفعہ تو اور اتمام حجت کر لیا جائے یا یوں کہا جائے کہ انھیں مقابلہ کا چیلنج دے دیا جائے۔ ممکن ہے وہ پورے عرب کی مخالفت سے مرعوب ہو جائیں اور یا محمدؐ کو روک دیں یا ان کا ساتھ چھوڑ دیں۔

یہ سوچ کر اب کی ذرا کڑے تیوروں کے ساتھ وہ جناب ابو طالبؑ کے پاس آئے اور اب انھوں نے یہ سخت قسم کا انداز گفتگو اختیار کیا جو امام الدین صاحب رام نگری کے الفاظ میں یوں تھا کہ:-

"ابوطالب تمھارا بھتیجا ہمارے معبودوں کی توہین کرتا۔ ہمارے باپ
دادا کو گمراہ کہتا اور ہمیں احمق ٹھہراتا ہے۔ اب ہم اس ہتک کو
برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لیے تم یا تو درمیان سے الگ ہو جاؤ
اور یا کھُل کر سامنے آجاؤ کہ ہم ہی فیصلہ ہو جائے۔"

(رسالہ مولوی دہلی ستمبر ۱۹۵۹ء)

جیسا کہ آئندہ ہم پھر مناسب موقع پر روشنی ڈالیں گے جناب ابوطالب کا موقف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شروع سے حضرت پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغام کو درست مانتے ہوئے تھے توحید کے مثل اپنے آباؤ اجداد کے وہ ہمیشہ ہی سے قائل تھے اور رسولؐ کو سچا اور امانت دار جب اغیار تک سمجھتے تھے تو وہ کیونکر نہ سمجھتے قوتِ احساس اور جرأت اظہار کی اُن میں کمی نہ تھی جس پر حمایت رسولؐ میں ان کے مجاہدات گواہ ہیں اور ماحول اور سماج کا کوئی دباؤ اُن پر اثر انداز نہیں تھا۔ اس سب کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جب سے حضرت رسول خداؐ نے کھُل کر اپنی رسالت کا گھر والوں پر اظہار فرمایا پہلے ہی دن سے ابوطالبؓ اُنھیں اللہ کا رسول تسلیم کرنے لگے مگر اُن کی مصلحت یہ تھی جو حکمت ربانی کے بھی بالکل مطابق تھی کہ اگر وہ لفظی طور پر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیں گے تو حفاظتِ رسولؐ کا کام جس طرح وہ انجام دے رہے ہیں اس طرح انجام نہ دے سکیں گے اس لیے وہ اپنے بچوں کو ہدایت کرتے تھے کہ محمدؐ کے پیچھے نماز میں شریک ہوا کرو مگر خود علانیہ اُس صف جماعت میں کھڑے

نہیں ہوتے تھے جو رسولؐ کے پیچھے قائم ہوتی تھی۔ اشعار میں رسالت پیغمبر کا اظہار کر دیتے تھے جو سوچنے والوں کی ذہنیت پر اثر انداز ہو سکے مگر رسمی الفاظ شہادتین کے ظاہر بظاہر زبان پر نہیں لاتے تھے۔ کہتے اور کرتے وہی تھے جو اسلام کا صحیح تقاضا ہے مگر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان نہیں کرتے تھے۔ اُن کے اس طرز عمل کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ سوا ایک ابولہب کے جو اپنی سسرال (بنی امیہ) کے اثر میں آ گیا باقی تمام بنی ہاشم کو بلا تفریق مسلم و کافر پیغمبر خداؐ کی حمایت پر متفق رکھ سکے۔ اور اُن کے اسی عمل کے نتیجہ میں مشرکین اتنی مدت تک کھل کر رسولؐ کی مخالفت سے باز رہے مگر اب مشرکین کے برداشت و تحمل کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور اب وہ "کرو یا مرو" والا انداز اختیار کر کے جناب ابو طالبؓ کے پاس آ رہے تھے تو جناب ابو طالبؑ نے مناسب سمجھا کہ اُن کی اس جوشیلی تقریر کے جواب میں وہ کوئی پُرجوش انداز اختیار نہ کریں بلکہ انھوں نے ملائم انداز میں اُن سے وعدہ کر لیا کہ اطمینان رکھو۔ میں پھر اس بارے میں محمدؐ سے ضرور بات کروں گا اور تمھارے خیالات و جذبات سے اُنھیں مطلع کر دوں گا۔ اس کے نتیجہ میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مشرکین کچھ مطمئن ہو کر جناب ابو طالبؑ کے پاس سے واپس ہوئے اور کم از کم اس وقت اُن کا وہ اشتعال فرو ہو گیا جو انسان کو ہوش و خرد سے کام لینے سے بالکل معذور بنا دیتا ہے۔

نتیجہ بھی معلوم تھا اور جو کچھ اس کے بعد خود کرنا ہے وہ بھی طے تھا مگر اپنے وعدے کا احترام تھا کہ جناب ابو طالبؑ نے حضرت پیغمبر خدا کے

سامنے قوم والوں کی اس تازہ گفتگو اور موقع کی نزاکت کا تذکرہ ضروری سمجھا۔

رسول اللہؐ نے اس کا وہ تاریخی جواب دیا جو ایک بشر کے کردار کی عالم ظاہر میں انتہائی معراج ہو سکتی ہے۔ دیکھنے کی بات ہے کہ بے ماں باپ کا یتیم جس کی پرورش اس چچا نے کی۔ کلمۂ حق کے زبان پر آتے ہی تمام قوم خون کی پیاسی پہلے سے ہے۔ دنیائے آب وگل میں بس ایک یہ چچا ہی ہے جو اب تک پشت و پناہ رہا ہے۔ اب وقت اتنا نازک آگیا ہے کہ اگر یہ چچا بھی دنیا کے عام چچاؤں کا ایسا ہو تو اس صورت حال میں یہ بھی ساتھ نہیں دے سکتا۔ وہ اس وقت اپنی گفتگو میں دشمنوں کی کثرت و طاقت اور اپنی پیرانہ سالی وضعف وقلت کے احساس کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اب اس کے بعد کے خطرات میں آپ کی حفاظت سے اپنے کو قاصر محسوس کر رہا ہے جس سے انتہائی پریشان ومضطرب ہے، مگر پیغمبرؐ کیا جواب دیتے ہیں؟ وہ چند جملے جن میں آدم سے لے کر اب تک کے تمام انبیاؑ ومرسلین کے عزم واستقلال کی روح سمٹ کر آگئی ہے۔

"خدا کی قسم یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند رکھ دیں جب بھی اس دعوت حق سے باز نہیں آسکتا، یا تو خدا اسے غالب کرے گا یا میں اسی سعی میں کام آجاؤں گا۔"

(ابن ہشام جلد ۱ ص ۸۹)

نہیں ہوتے تھے جو رسولؐ کے پیچھے قائم ہوئی تھی۔ اشعار میں رسالت پیغمبر کا اظہار کر دیتے تھے جو سوچنے والوں کی ذہنیت پر اثر انداز ہو سکے مگر رسمی الفاظ شہادتین کے ظاہر بظاہر زبان پر نہیں لاتے تھے۔ کہتے اور کرتے وہی تھے جو اسلام کا صحیح تقاضا ہے مگر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان نہیں کرتے تھے۔ اُن کے اس طرز عمل کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ سوا ایک ابو لہب کے جو اپنی سسرال (بنی امیہ) کے اثر میں آ گیا باقی تمام بنی ہاشم کو بلا تفریق مسلم و کافر پیغمبر خداؐ کی حمایت پر متفق رکھ سکے۔ اور اُن کے اسی عمل کے نتیجہ میں مشرکین اتنی مدت تک کھل کر رسولؐ کی مخالفت سے باز رہے مگر اب مشرکین کے برداشت و تحمل کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور اب وہ "کرو یا مرو" والا انداز اختیار کر کے جناب ابو طالبؓ کے پاس آ رہے تھے تو جناب ابو طالبؓ نے مناسب سمجھا کہ اُن کی اس جوشیلی تقریر کے جواب میں وہ کوئی پُر جوش انداز اختیار نہ کریں بلکہ انھوں نے ملائم انداز میں اُن سے وعدہ کر لیا کہ اطمینان رکھو۔ میں پھر اس بارے میں محمدؐ سے ضرور بات کروں گا اور تمھارے خیالات و جذبات سے اُنھیں مطلع کر دوں گا۔ اس کے نتیجہ میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مشرکین کچھ مطمئن ہو کر جناب ابو طالبؑ کے پاس سے واپس ہوئے اور کم از کم اس وقت اُن کا وہ اشتعال فرو ہو گیا جو انسان کو ہوش و خرد سے کام لینے سے بالکل معذور بنا دیتا ہے۔

نتیجہ بھی معلوم تھا اور جو کچھ اس کے بعد خود کرنا ہے وہ بھی طے تھا مگر اپنے وعدے کا احترام تھا کہ جناب ابو طالبؑ نے حضرت پیغمبر خداؐ کے

سامنے قوم والوں کی اس تازہ گفتگو اور موقع کی نزاکت کا تذکرہ ضروری سمجھا۔

رسول اللہ ص نے اس کا وہ تاریخی جواب دیا جو ایک بشر کے کردار کی عالم ظاہر میں انتہائی معراج ہو سکتی ہے۔ دیکھنے کی بات ہے کہ بے ماں باپ کا یتیم جس کی پرورش اس چچا نے کی۔ کلمۂ حق کے زبان پر آتے ہی تمام قوم خون کی پیاسی پہلے سے ہے۔ دنیائے آب وگل میں بس ایک یہ چچا ہی ہے جو اب تک پشت و پناہ رہا ہے۔ اب وقت اتنا نازک آگیا ہے کہ اگر یہ چچا بھی دنیا کے عام چچاؤں کا ایسا ہو تو اس صورت حال میں یہ بھی ساتھ نہیں دے سکتا۔ وہ اس وقت اپنی گفتگو میں دشمنوں کی کثرت و طاقت اور اپنی پیرانہ سالی و ضعف و قلت کے احساس کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اب اس کے بعد کے خطرات میں آپ کی حفاظت سے اپنے کو قاصر محسوس کر رہا ہے جس سے انتہائی پریشان و مضطرب ہے، مگر پیغمبر ص کیا جواب دیتے ہیں؟ وہ چند جملے جن میں آدم سے لے کر اب تک کے تمام انبیاؤ مرسلین کے عزم و استقلال کی روح سمٹ کر آگئی ہے۔

> “خدا کی قسم یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند رکھ دیں جب بھی اس دعوت حق سے باز نہیں آسکتا، یا تو خدا اسے غالب کرے گا یا میں اسی سعی میں کام آجاؤں گا۔”

(ابن ہشام جلد ۱ ص۸۹)

کے۔ اے حمید بی۔ اے (لنڈن)، بیرسٹرایٹ لا لاہور نے باوجودیکہ اپنی کتاب "مسلمانان عالم" میں جس پر مولانا سید سلیمان ندوی کا مقدمہ بھی ہے، اموی رجحانات کی پوری پوری نمائندگی کرتے ہوئے انتہائی گستاخانہ انداز میں ہر مقام پر جناب ابو طالب رضوان اللہ علیہ کا استخفاف کیا ہے مگر یہاں حقانیت کے دباؤ سے اُنھوں نے بھی جو جواب جناب ابوطالب کا درج کیا ہے وہ وہی سب کچھ بتا دینے کے لیے کافی ہے جو ہم نے جناب ابوطالبؓ کے موقف کی کسی حد تک تشریح کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔۔

> "بوڑھے چچا کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ کہا، میں یہاں آنے سے پیشتر ہی تمہارے جواب سے واقف تھا۔ خیر جب تک میں زندہ ہوں۔ تمہاری مدد کروں گا" ابوطالب نے قریش کے لوگوں سے کہا "تم محمدؐ کو جانتے ہو۔ وہ ایک شریف اور معزز انسان ہے تم نے خود ہی اُسے "امین" کا خطاب پیش کیا تھا۔ اس کا زاویۂ نگاہ تم سے علٰحدہ ہے۔ وہ ایک خدا کی پرستش کرتا ہے۔ تم اُسے خدا کی پرستش سے کیوں ہٹاتے اور اس کے لیے اس کی جان پر مصیبتیں کیوں ڈھا رہے ہو"
>
> (مسلمانان عالم، جلد ا ص ۴۵-۴۶)

اگر جناب ابوطالبؓ مسلک میں رسولؐ سے متحد نہ تھے تو رسولؐ کے جواب پر غصہ آنے کے بجائے اُن کی آنکھوں سے آنسو کیوں نکل آئے؟

وہ اگر واقعی رسولؐ کو منع کرنے ہی کے لیے آئے تھے تو آپ کے جواب پر یہ کیوں کہا کہ "میں یہاں آنے سے پیشتر ہی تمہارے جواب سے واقف تھا"۔

صاف وہی بات ظاہر ہے جو ہم نے بیان کی ہے کہ یہ سب حکمت عملی تھی ورنہ وہ جانتے تھے کہ ہزار مصیبتیں آئیں، رسولؐ کو اپنے مشن کو ترک نہیں کرنا چاہیے اور نہ وہ ترک کریں گے اور مجھے بھی آخر دم تک اُن کا ساتھ دینا ہے چاہے اس سلسلہ میں مجھے بھی اپنی کیا، اپنی اولاد تک کی قربانی پیش کر دینا پڑے جس کا عملی مظاہرہ اس کے بعد وقت آنے پر ہو جائے گا۔

براہ راست معاملت کی کوشش

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ تاریخ میں جو واقعات کا سلسلہ ہے وہ ترتیب واقعات کے بظاہر مطابق نہیں ہے، چنانچہ گزشتہ تمام واقعات کے بعد یہ ذکر آتا ہے کہ جب تخویف کی تمام صورتیں بیکار ثابت ہوئیں اور جناب ابو طالبؑ کے ذریعہ سے کاربراری ہوتے نظر نہ آئی تو اب وہ سوچے ترغیب کی صورت اختیار کی جائے اور براہ راست محمدؐ سے گفتگو کی جائے اس کے لیے عتبہ بن ربیعہ کو جو اُن کا ایک موقر سردار تھا، رسولؐ کے پاس بھیجا۔

یہ عتبہ کون؟ وہی جس کی بیٹی ہند بنت عتبہ ہندۂ جگر خوارہ مشہور ہے جو ابو سفیان کی بیوی اور امیر شام معاویہ کی ماں ہے۔

عتبہ نے حضرتؐ سے مل کر کہا :-

"اے محمدؐ! قوم میں پھوٹ ڈالنے سے کیا فائدہ ؟ اگر تمھیں سرداری حاصل کرنا ہے تو ہم سب مل کر تمھیں سردار تسلیم کرنے کے لیے آمادہ ہیں ۔ اگر کسی بڑے گھرانے کی کسی حسین سے حسین لڑکی سے تم نکاح کرنا چاہتے ہو تو بتا دو کہ ہم اس کا انتظام کر دیں، اگر دولت کی فکر ہے تو جتنی کہو دولت تمھارے قدموں پر ڈال دی جائے ـــ"

اس کے جواب میں حضرت محمد مصطفٰے صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی گفتگو کرنا نہیں چاہی، بلکہ قرآن مجید کی کچھ آیتیں پڑھ پڑھ کر عتبہ کو سنانے لگے جس پر وہ حیران ہو کر واپس گیا اور قریش سے کہا کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو ۔

ہمارے نزدیک گزشتہ غیظ و غضب اور اشتعال کے واقعات کے اس گفتگو کا کوئی تناسب نہیں ہے بلکہ ترغیب کا درجہ تخویف سے مقدم ہوتا ہے اس لیے یہ سابق کے بیان شدہ بہت سے واقعات کے پہلے کی بات ہوگی جس کے صحیح وقت کا تعین ہم نہیں کر سکتے ہیں ۔

بہرحال یہی دو حربے ہو سکتے ہیں جو کسی شخص کو جو حق کے راستے سے ہٹ سکتا ہو، اس کے اصول اور حقانیت سے ہٹا سکتے ہیں ۔ یکے بعد دیگرے وہ دونوں آزما لیے گئے اور ناکام ہوے ۔ معلوم ہو گیا کہ یہ نہ طمع کی وجہ سے راہ حق کو چھوڑیں گے اور نہ خوف کی بنا پر ـــ

اس طرح مشرکین کو بالکل مایوسی ہوگئی اور اس کے بعد اب یہی ایک صورت ہو سکتی تھی کہ خود ان کے وجود کو راستے سے ہٹایا جائے۔ یہی اہل باطل کی آخری ترکیب ہوتی ہے مگر اس کے اختیار کرنے میں بھی جناب ابو طالب رض کی شخصیت و وجاہت کی وجہ سے اُنھیں بڑی پیچیدگی محسوس ہو رہی تھی۔

مسلمانوں پر تشدّد

اب مشرکین کا غم و غصہ بہت بڑھ گیا تھا۔ ایک طرف تو اپنے اختیار کردہ ہر قسم کے تدابیر کا رسولؐ کو اُن کے موقف سے ہٹانے میں ناکام ہونا۔ پھر یہ کہ اسلام کی جاذبیت سے روز بروز اُس کے حلقے کا وسیع ہونا جس میں اُن بڑے بڑے رؤسا کو چھوڑ کر ہر قبیلے کے دبے اور پسے ہوئے اشخاص اور خود اُن رئیسوں کے نوکر چاکر اور حاشیہ بردار تک شامل ہوتے جاتے تھے۔ اب جناب ابوطالب رض کی وجہ سے اُنھیں براہ راست خود حضرت رسولؐ کو کوئی آزار پہونچانے کی تو ابھی ہمت نہیں ہوئی۔ علامہ سید محسن امین کی لفظوں میں:۔

منع اللہ رسولہؐ منہم بعمہ ابی طالب۔	خداوند عالم اپنے رسولؐ کی اُن کے چچا ابوطالب کے ذریعے حفاظت کر رہا تھا۔

مگر انھوں نے اُن کمزور مسلمانوں کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا اور انھیں سخت سے سخت ایذائیں دینے لگے۔ ابن سعد لکھتا ہے:۔

لما کثر المسلمون وظہر	جب مسلمانوں کی تعداد کافی بڑھ گئی

الایمان، وتحدّث به
ثار ناس کثیر من المشرکین
بمن امن من قبائلهم
فعذّبوهم وسجنوهم
وارادوا فتنتهم عن
دینهم۔

(طبقات جلد ۱ صفحہ ۱۳۶)

اور ایمان نمایاں ہو گیا اور اُس کا چرچا ہونے لگا تو کفار قریش میں بت پرستوں نے اپنے قبیلوں میں کے ایمان لانے والے اشخاص پر یورش کر دی، انھیں سخت تکلیفیں پہنچائیں، اُنھیں قید کیا اور کوشش کی کہ کسی طرح اُن کے دین سے اُن کو منحرف کریں۔

ان مظالم میں سے کچھ کو ہمارے محترم بزرگ دوست جناب ابو محمد لطیف صاحب انصاری کے قلم سے دیکھیے جن کی کتاب "اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ" جلد اول رضا کار بکڈپو لاہور سے شائع ہوئی ہے:

"حضرت یاسر جو کہ ایک مفلس مسلمان تھے ان مظالم کو برداشت کرتے کرتے دنیا سے چل بسے۔ ان کی بیوی حضرت سمیہ کو ابوجہل نے برچھی مار کر شہید کر دیا۔ ان کے بیٹے عمار اسی قسم کے مظالم کا تختۂ مشق تھے۔ حضرت خباب بن الارت پر بھی انتہائی سختیاں کیں۔ ایک روز اُنھیں دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹا دیا اور جب تک وہ ٹھنڈے نہ ہو گئے اُنھیں نہ چھوڑا۔ حضرت بلال حبشی مؤذن اور حضرت صہیب رومی کو عرب کی جلتی ہوئی ریت پر لٹا دیتے تھے اور اُن کی چھاتی پر تپتے ہوئے پتھر رکھ دیتے تھے۔ اس پر ان کی زبان پر احد۔ احد کے کلمات جاری رہتے تھے۔ حضرت زنیرہ

جو کہ ایک مسلمان کنیز تھیں ابوجہل نے ان کی آنکھیں نکال دیں۔ ان سختیوں پر رسول اللہؐ ہمیشہ انھیں تسلی دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ تم لوگ اللہ کی رحمت کے منتظر رہو۔"

(اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد اول صہ ۵۸-۵۹)

ملک حبشہ کی طرف ہجرت

حضرت پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو خود اپنے جسم کے زخموں سے اتنی تکلیف نہ پہونچتی جتنی ان بے چارے مسلمانوں کی حالت کو دیکھ کر اور معلوم کر کے آپ کو تکلیف پہونچتی تھی، چنانچہ جب یہ شدائد بہت بڑھ گئے تو آپ نے ان کو رائے دی کہ تم لوگ اب یہاں سے نکل کر ادھر اُدھر منتشر ہو جاؤ۔ انھوں نے کہا "کہاں جائیں؟" آپ نے فرمایا حبش چلے جاؤ۔ وہاں عیسائیوں کی حکومت تھی جو اس وقت تک قائم ہے، چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں یہ لوگ ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ نکلنا شروع ہوئے اور آگے جا کر کہیں اکٹھا ہو کر پہلی مرتبہ یہ گیارہ مردوں اور چار عورتوں کا قافلہ تھا جو حبش پہونچا۔ یہ نبوت کے پانچویں سال ماہ رجب کا واقعہ ہے۔ (طبقات ابن سعد جلد ۱ صہ ۱۳۶)

رجب کے بعد شعبان اور ماہ رمضان یعنی دو مہینے کچھ دن ان لوگوں نے وہاں قیام کیا۔ پھر خواہ وطن کی محبت میں جوش آیا ہو یا پردیس کی زندگی کے مشکلات نے پریشان کیا ہو۔ یا یہ خیال ہوا ہو کہ اتنے دن کی

دُوری سے ممکن ہے کفارِ قریش نے محسوس کر لیا ہو کہ یہ لوگ سخت گیری وغیرہ سے دین نہیں چھوڑ سکتے لہذا اپنے رویہ میں تبدیلی پیدا کریں اور ایک ضعیف روایت یہ ہے کہ انھیں یہ اطلاع ملی کہ اہلِ مکہ مسلمان ہو گئے بہر حال کچھ ایسا ہوا کہ یہ لوگ واپس آ رہے مگر واپسی پر ان کی اُمید کے برعکس یہ صورت پیدا ہوئی کہ مشرکین نے اور زیادہ تشدد سے کام لیا اور پہلے سے زیادہ سخت مظالم شروع کر دیے۔ ادھر ان واپس آنے والوں نے عیسائیوں کے اخلاق اور اہلِ حبش کے اپنے ساتھ حُسنِ سلوک کا بھی چرچا کیا جس پر مشرکین کو اور زیادہ برہمی پیدا ہوئی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جنابِ رسالتمآبؐ نے بعثت کے ساتویں سال دوبارہ حکم ہجرت دیا اور اب کی پہلے سے زیادہ تعداد میں تراسی مرد، گیارہ قریشی خواتین اور سات عورتیں باہر کی سب ایک سو ایک آدمی جناب جعفر طیار کی سرکردگی میں حبشہ کی طرف روانہ ہوئے۔ (طبقات ابن سعد جلد ۱ صـ ۱۳۸)

علامہ طبرسی نے لکھا ہے کہ جناب جعفرؓ کے ساتھ ستر آدمی سمندر کے راستے سے روانہ ہوئے۔ (اعلام الوریٰ)

علامہ سید محسن امین عاملی لکھتے ہیں، اسّی مرد اور اٹھارہ ۱۸ عورتیں ان میں جناب جعفر بن ابی طالب تھے اور اُن کی شریک حیات جناب اسماء بنت عمیس۔ (اعیان الشیعہ جلد ۲ صـ ۹۲)

شہنشاہ حبش کا دربار

اور

حضرت جعفر کا تبلیغی کارنامہ

مشرکین قریش کو ان اشخاص سے تو کوئی ذاتی عداوت تھی نہیں، کہ وہ اُن کے یہاں سے چلے جانے پر سکون محسوس کرتے اور اطمینان کی سانس لیتے۔ اُنھیں تو اُس تحریک سے عداوت تھی جو اُن کے باطل راستے کے خلاف پھیلتی جا رہی تھی، اور حبش میں پہلی دفعہ کے وہاں کے حالات سن کر اب اُنھیں یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں وہاں اس تحریک کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ مل جائے، اس لیے اُنھوں نے ان مہاجرین کا جو حبش جا رہے تھے تعاقب کیا مگر کفار کے پہونچنے سے پہلے یہ لوگ کشتیوں میں سوار ہو چکے تھے اور کشتیاں روانہ ہو گئی تھیں اس لیے وہ کفار کے پنجے سے نکل کر محفوظ طور پر حبشہ میں پہونچ گئے۔

اب یہاں کی صورت حال خواجہ محمد لطیف صاحب انصاری کے الفاظ میں ملاحظہ ہو: — "حبشہ میں انھیں امن ملا، آزادی نصیب ہوئی اور یہ اچھی فضا میں اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے لیکن مسلمان مہاجرین کے اس اطمینان کو کفار قریش برداشت نہ کر سکے۔ اُنھوں نے عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ کو تحفے تحائف دے کر نجاشی کے دربار میں بھیجا۔ اس وفد نے نجاشی کے دربار میں حاضر ہو کر تحفے تحائف

پیش کرنے کے بعد اپنے معروضات پیش کیے اور کہا کہ مکہ کے کچھ شریر لوگ بھاگ کر آپ کے ملک میں پناہ لے چکے ہیں۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ انہیں ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ نجاشی نے کہا جب تک ہم دوسرے فریق کی بات نہ سُن لیں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ حضرت علیؓ کے بھائی اور مہاجرین کے سالار حضرت جعفر بن ابی طالب دربار میں بُلائے گئے۔

جب حضرت جعفر مع جماعت مہاجرین حاضر دربار ہوئے تو نجاشی نے دریافت کیا کہ آپ لوگوں کے اصول وعقائد کیا ہیں اور آپ کے ملک والے آپ کے خلاف کیوں ہیں؟ حضرت جعفر نے اپنی تقریر اس طرح شروع کی:-

"اے بادشاہ! ہمارے ملک کے لوگ جاہل تھے، مردار کھاتے تھے اور بیہودہ بکا کرتے تھے۔ ان میں انسانیت نہ تھی اور نہ سچی ہمدردی مہمان داری اور ہمسایہ کے حقوق سے نا آشنا تھے، کسی قانون وقاعدہ کے پابند نہیں تھے، ان حالات میں اللہ تعالےٰ نے اپنے انتہائی فضل وکرم سے ہم میں ایک رسول بھیجا جس کی امانت ودیانت، صدق وصفا، حسب ونسب اور زہد وتقوےٰ سے ہم اچھی طرح واقف تھے۔ اس نے ہمیں توحید کی دعوت دی اور شرک اور بت پرستی کی گمراہی سے نکالا۔ اس نے ہمیں سچ بولنے، وعدہ وفا کرنے، گناہوں سے بچنے، نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کی تلقین فرمائی، ہمارا قصور صرف یہی ہے کہ ہم اُس خدا کے سچے نبی پر ایمان لائے ہیں اس جرم میں ہماری قوم ہم پر سختی اور تشدد کرنے پر تُلی ہوئی ہے، ہماری

قوم چاہتی ہے کہ ہم خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت ترک کرکے پتھر، مٹی اور لکڑی کے بنے ہوئے بتوں کی پرستش شروع کر دیں۔ اُن کے جور و جفا سے بچنے کے لیے ہم نے آپ کے ملک میں پناہ لی ہے"

اس تقریر کا نجاشی پر بہت اثر ہوا اور اُس نے اس کلام خدا کے سننے کی تمنا کا اظہار کیا جو رسول اللہؐ پر نازل ہوا تھا۔ حضرت جعفرؓ نے سورہ مریم کی تلاوت فرمائی۔ نجاشی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُنھوں نے رسول اللہؐ کی صداقت کا اعتراف کیا اور کہا "بیشک حضرت محمدؐ وہی رسول ہیں جن کے تشریف لانے کی یسوع مسیحؑ نے خبر دی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں ان کے زمانے میں ہوں"

اس پر کفار مکہ کو نہایت مایوسی سے واپس جانا پڑا۔ مسلمان ایک عرصہ تک حبشہ میں آباد رہے اور نہایت امن و اطمینان کی زندگی بسر کرتے رہے" (اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد اول ص۶۱-۶۲)

اسلام کی رفتار ترقی

مشرکین کے لیے یہ امر نہایت پریشان کن بنا ہوا تھا کہ وہ جو کچھ ہو رہا ہے اُس کے روکنے کی ہر طرح ترکیبیں کر رہے ہیں اور وہاں اسلام کے دائرہ میں وسعت ہی پیدا ہوتی جاتی ہے۔

جناب ابو طالبؑ کے اثر سے بنی ہاشم تو تمام ہی حضرت پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ رہے اور سوا ایک ابولہب کے جو اولاد

عبدالمطلب میں تھا مگر اُس کی شادی بنی اُمیہ میں ہو گئی تھی اور معاویہ کی پھوپھی اُم جمیل اُس کے حبالۂ عقد میں تھی، اس طرح بیوی کے اثر میں آ کر وہ اپنے خاندان سے الگ ہو گیا تھا اور اب دوسرے مشرکین تو جناب ابوطالب اور دوسرے بنی ہاشم کا خیال کر کے ذرا پیغمبر خداؐ کی شان میں گستاخیوں سے ہچکچاتے بھی تھے مگر وہ اس کو لگا دیتے تھے اور یہ میاں بیوی آپ کو تکلیف پہونچانے میں سب سے آگے رہتے تھے، جس کے لیے قرآن مجید میں ایک پورا سورہ موجود ہے جس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ابولہب یہ سب کچھ مال و دولت کی طمع میں کرتا تھا کیونکہ کہا جا رہا ہے :-

تبت یدا ابی لهب و تب ،	ٹوٹیں ہاتھ اس ابولہب کے اور وہ
ما اغنیٰ عنه ماله و ما	تباہ ہو، اسے اس کے مال اور اس کی
کسب ۔	کمائی سے کچھ فائدہ نہ پہونچ سکے گا ۔

اور صراحت کے ساتھ اُس کی بیوی کے کردار کا بھی ذکر کیا ہے جو پیغمبر خداؐ کے راستے میں خار دار لکڑیاں پھیلا دیا کرتی تھی کہ آپ اندھیرے میں اُن سے اُلجھ کر تکلیف اُٹھائیں۔ باقی تمام بنی ہاشم رسولؐ کے ساتھ رہے۔ انہی میں جناب حمزہؓ بھی تھے جن کی قوت و جرأت قریش میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی تھی مگر انھوں نے بھی اعلان اپنے اسلام کا نہ کیا تھا۔ خاموش رہا کیے تھے لیکن مشرکین کی ایذا رسانی اور خصوصیت کے ساتھ ابولہب کی بدتمیزیوں سے متاثر ہو کر انھوں نے علانیہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حمایت و تائید اور اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔

عام مورخین نے اسی سلسلہ میں جناب عمر بن الخطاب کے اسلام کو بھی بڑی اہمیت دی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ بڑے ہی سخت قسم کے رسولؐ کے دشمن تھے اور حضرت کے قتل کرنے کا منصوبہ بنا کر آپ کے پاس آرہے تھے مگر حضرتؐ کے پاس پہونچ کر کچھ ایسی تبدیلی ہوئی کہ فوراً اسلام قبول کر لیا۔

ہمارے مستند احادیث اس کی نوعیت کے اظہار سے خاموش ہیں مگر یہ حیرت کی بات ضرور ہے کہ اس اسلام لانے کے موقع سے پہلے تبلیغ اسلام کے آٹھ نو برس کے حالات میں آپ کا نام مخالفتوں کے ذیل میں کسی تاریخ میں نمایاں ہو کر سامنے نہیں آیا۔ نہ کسی کانفرنس کے شرکا میں جو رسولؐ کی مخالفت میں ہوئی تھی۔ نہ کسی وفد میں جو جناب ابو طالبؓ کے پاس آیا تھا۔ نہ کسی تصادم کے موقع پر جس کا ذکر تاریخ میں آیا ہے مگر جب اسلام لائے تو اب یہ سن رہے ہیں کہ آپ کو مخالفین کے طبقہ میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ اب اس دور میں آپ بھی اسلامی جماعت کے حلقے میں داخل ہو گئے تھے مگر ایک عجیب بات اور محسوس ہوتی ہے کہ مورخین آنکھ بند کر کے مجمل طور پر جب تبصرہ کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ آپ کے اسلام سے اسلام کی شان و شوکت میں یقیناً اضافہ ہو گیا مگر جب تفصیلی واقعات سامنے آتے ہیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ کفار و مشرکین کے ہاتھوں رسولؐ اور بنی ہاشم کے خلاف اس کے بعد سے جو سختی و تشدد کا دور شروع ہوا ہے اُس کی نظیر

اس کے پہلے تک تاریخ اسلام میں نظر نہیں آتی جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے آئے گی ۔

شعب ابی طالب میں محصوری

مشرکین کی سب تدبیریں ختم ہو چکی تھیں ۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اسلام کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے ۔ حبشہ میں جناب جعفرؓ اور دوسری لفظوں میں اسلام کو جو کامیابی ہوئی اُس نے اور زیادہ ان کو پریشان کر دیا ۔ وہ یقینی طور پر محسوس کر چکے تھے کہ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اُن کی سرگرمی سے باز نہیں رکھا جا سکتا اور یہ بھی کہ ابوطالبؓ کو آپ کی نصرت و حمایت سے ہاتھ اُٹھانے پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا ۔ اس کے ساتھ صورت حال یہ ہے کہ جناب ابوطالبؓ کے اثر سے دوسرے بنی ہاشم یہاں تک کہ جنھوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا ہے وہ بھی رسولؐ کی تائید و حمایت پر آمادہ رہتے ہیں لہٰذا اب اُنھوں نے تمام بنی ہاشم پر سماجی، کاروباری اور معاشی دباؤ ڈالنے کا فیصلہ کیا کہ جب یہ سب غیر معمولی پریشانی میں مبتلا ہوں گے تو لازماً یا تو جناب ابوطالبؓ اور اُن کے ساتھ رسول اللہؐ کو مجبور کر دیں گے کہ وہ اپنے رویہ میں تبدیلی پیدا کریں اور یا یہ سب اُن سے علیحدہ ہو جائیں گے ۔ کم از کم اُن میں پھوٹ تو پڑ ہی جائے گی ۔ پھر اگر ابوطالبؓ اپنی ذات سے یا تھوڑے آدمی اور رسولؐ کے ساتھ رہ بھی گئے

تو وہ کیا کر سکتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے بنی ہاشم کے سوا دوسرے تمام قبائل کو جمع کر کے آپس میں یہ معاہدہ کیا کہ تمام بنی ہاشم کا بائیکاٹ کیا جائے اس طرح کہ نہ اُن سے شادی بیاہ کیا جائے اور نہ خرید و فروخت نہ کسی قسم کا میل جول رکھا جائے اور جس طرح ممکن ہو محمد مصطفےٰؐ کی زندگی کا خاتمہ کیا جائے۔ چنانچہ اس معاہدہ کو ایک دستاویز کی شکل میں لکھ کر سب قبیلوں کے نمائندوں کے دستخط لیے گئے اور اسے "جوف کعبہ" میں آویزاں کر دیا گیا اور بعثت رسولؐ کے ساتویں برس محرم کی پہلی تاریخ اس محاصرہ کا آغاز ہو گیا۔ (طبقات ابن سعد جلد اول ص ۱۳۹-۱۴۰)

جناب ابو طالب نے تمام بنی ہاشم کو جمع کیا اور اپنے ایک مکان میں جو پہاڑ کی گھاٹی میں ایک محفوظ قلعہ کی شکل میں تھا اور "شعب ابی طالب" کے نام سے مشہور تھا، ان سب کو محفوظ کر دیا۔

علامہ طبرسیؒ لکھتے ہیں کہ یہ سب چالیس آدمی تھے اور جناب ابو طالبؑ نے کعبہ و حرم اور رکن و مقام کی قسم کھا کر کہا کہ اے بنی ہاشم سن لو کہ اگر محمدؐ کا بال بیکا ہوا تو میں سب کو موت کے مُنہ میں دے دوں گا۔

(اعلام الوریٰ)

صرف ابو لہب تھا جو بنی ہاشم سے کٹ کر الگ ہو گیا اور اُس نے باقی قبائل قریش کا ساتھ دیا۔ (ابن سعد جلد ۱ ص ۱۴۱)

مشرکین نے اس محصور جماعت پر آب و دانہ بند کر رکھا تھا اس لیے کہ مکہ کے تو سب آدمی خود یہ عہد کیے ہوئے تھے کہ ان کے ہاتھ کوئی چیز فروخت

نہ کریں گے اور جو باہر کے آدمی آتے تھے وہ ان کے خوف سے بنی ہاشم کے ہاتھ کوئی چیز فروخت نہ کرتے تھے اور اگر کوئی کچھ فروخت کر دیتا تھا تو مکہ والے اُس کا مال و متاع لوٹ لیتے تھے اور اس میں اتنی زبردست سرگرمی سے کام ہو رہا تھا کہ ابو جہل، عاص بن وائل، نضر بن حارث، اور عقبہ بن ابی معیط ایسے بڑے سرغنہ لوگ خود اُن راستوں پر جو مکۂ معظمہ میں داخل ہوتے ہیں گشت کرتے تھے اور جسے دیکھتے تھے کہ اُس کے پاس کوئی غلہ وغیرہ تجارتی ہے اُسے کہہ دیتے تھے کہ وہ بنی ہاشم کے ہاتھ کوئی چیز فروخت نہ کرے ورنہ نقصان اُٹھائے گا۔

(اعلام الوریٰ)

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کئی کئی وقت کھانا پانی نہیں ملتا تھا اور بعض وقت بھوک پیاس سے چھوٹے بچّوں کے رونے اور بلبلانے کی آواز گھاٹی کے باہر تک سنائی دیتی تھی۔ (ابن سعد جلد ا صفحہ ۱۲۵)

پھر یہ کہ ہر شب کو یہ خطرہ تھا کہ کہیں مشرکین رسالت مآبؐ کی زندگی کا خاتمہ نہ کر دیں۔ اس لیے جناب ابو طالبؑ پوری رات جاگ کر بسر کرتے تھے اور جب رسولؐ آرام فرماتے تھے تو وہ تلوار لیے ہوئے پیغمبرؐ کے بستر کے پاس کھڑے رہتے تھے۔ پھر یہ کہ رات میں کئی دفعہ حفاظت کے لیے جگہ بدل بدل کر آپ کو لٹاتے تھے اور دن کو اپنے بیٹوں اور بھتیجوں کو آپ کے پاس رکھتے تھے۔

یہ عالم دو چار مہینے نہیں بلکہ تین سال تک برقرار رہا۔ درمیان میں

صرف موسم حج میں جب کہ خونریزی سے پرہیز کرنے کی پابندی رہتی تھی ، رسول خدا، شعب سے باہر نکلتے تھے اور مختلف قبیلوں میں دورہ کرکے اُنھیں پیغام الٰہی قبول کرنے پر آمادہ فرماتے تھے مگر ابولہب ساتھ لگا رہتا تھا وہ کہتا جاتا تھا کہ یہ میرا بھتیجا ہے ۔ اس کی بات نہ ماننا ۔ یہ (معاذ اللہ) غلط گو اور جادوگر ہے ۔ موسم حج گزرنے کے ساتھ ہی پھر رسولؐ اور تمام بنی ہاشم مکان میں بند ہو جاتے تھے ۔

اس سختی و صعوبت نے ایک طرف ان محصورین کو جسمانی طور پر انتہائی بے تاب و تواں بنا دیا اور دوسری طرف مالی مشکلات کی حد نہ رہی ۔ جناب خدیجہؓ جو ملکۃ التجارِ عرب تھیں، اُن کی پوری دولت اسی تین برس کے محاصرے میں اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے کام آ گئی کیونکہ کئی کئی وقت کے بعد آب و غذا جو ممکن ہوتا تھا وہ بسا اوقات بڑی ہی زیادہ قیمت پر ۔

اس دوران میں مشرکین نے یہ جانچ کی کہ بنی ہاشم اور بالخصوص جناب ابوطالبؓ کی اخلاقی قوت میں کوئی کمزوری پیدا ہوئی یا نہیں مگر کیا کہنا اُس پیرِ جواں ہمت کے استقلال کا جس نے ہمیشہ کی طرح اب بھی اُنھیں مایوس کن ہی جواب دیا ۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس ابتلا میں صرف بنی ہاشم تھے اور باقی تمام مسلمان جو دیگر قبائل کے تھے اُن سے کوئی سروکار نہ تھا اور یہ انتہائی حیرت کی بات ہے کہ ان لوگوں نے اس طویل عرصہ میں جو

تین برس کا ہے کسی قسم کی ہمدردی کا بھی حضرت پیغمبر اسلامؐ سے ثبوت نہیں دیا۔ یہاں تک کہ یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ انھوں نے مخفی ذرائع سے رسولؐ تک آب و غذا پہونچانے کا کبھی بند و بست کیا ہوتا یا یہ بھی نہیں ملتا کہ انھوں نے اپنے اثرات یا تعلقات سے جو اُن کے اور رؤسائے مشرکین کے درمیان تھے گفت و شنید ہی کر کے اُن کو اس محاصرہ کے اُٹھانے یا اُس کے نرم کرنے پر آمادہ کیا ہوتا۔ ایسی کوئی روایت نہیں ملتی جب کہ ابو العاص بن ربیع کے متعلق جو کافر تھا۔ یہ بیان صحیح ہو یا نہ ہو مگر یہ مل جاتا ہے کہ چونکہ عام مورخین کی زبان میں جناب خدیجہؓ کی بیٹی اور بعض کے بیان کے مطابق بھانجی اُسے منسوب تھیں تو اس رشتے کا حق وہ ادا کر رہا تھا کہ کبھی راتوں کو آب و طعام کے پہونچانے کا انتظام کر دیتا تھا۔ (اعلام الوریٰ) مگر بڑے دعویداران وفاداری و جاں نثاری کا کسی ضعیف سے ضعیف روایت میں بھی نام نہ آنا کہ اُنھوں نے کوئی اس طرح کی غم گساری کی ہو ہزار در ہزار عبرتوں کا سرمایہ ہے اور یہ وہ معمہ ہے جو کسی صورت سے تاریخ و حدیث کے مطالعہ سے حل نہیں ہوتا۔

آخر قدرت کا کرشمہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ اُس عہد نامے کی دستاویز کو جو کہ رؤسائے قریش کی مہر کردہ کعبہ کے اندر آویزاں تھی دیمک نے کھا لیا اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ بس اُتنا حصہ چھوڑ دیا جس میں اللہ کا نام اور اُس کی ثنا و صفت تھی اور پھر اس سے زیادہ قدرتِ ربانی کا

ظہور یہ تھا کہ اس کی اطلاع حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ہو گئی جو کہ قلعہ کے اندر محصور تھے اور جن کے روابط بھی باہر سے منقطع تھے۔ اس کی کوئی توجیہ مادی اسباب سے ہونا ناممکن ہے۔ یہ اور بات ہے کہ موجودہ زمانہ کے مذاق کو پیش نظر رکھ کر معجزات وغیرہ کے تذکرہ سے پرہیز کرنے والے مورخین ایسی لفظوں میں اُس کا ذکر کریں جو کسی اعجاز کا اظہار نہ کرتی ہوں جیسے "مسلمانانِ عالم" کے مصنف نے لکھا ہے:۔

"اتفاق کہیے یا قدرت کا ہاتھ اس حکم نامہ کو دیمک چاٹ گئی۔ جب رسول خداؐ کو اس کی خبر پہنچی تو ابو طالب سے مخاطب ہوئے "چچا! خدا کے ایک ناتواں کیڑے نے قریش کے حکم نامہ کا خاتمہ کر دیا ہے۔ وہ حکم نامہ جو مجسّم ناانصافی، ظلم و تعدی کی ایک شہادت تھی کیڑا چاٹ گیا ہے اور سوائے اللہ کے نام کے وہاں کچھ بھی نہیں رہا۔"

اب اصل واقعہ کو خواہ "اتفاق کہیے یا قدرت کا ہاتھ" مگر رسول خداؐ کی اطلاع کو یوں کہنا کہ "جب رسولِ خداؐ کو اس کی خبر پہنچی" کہاں تک حقیقت کے مطابق ہو سکتا ہے جب کہ صورت حال یہ بتاتی ہے جس کا حال خود اس مصنف کے بعد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تک اُس لپٹی ہوئی دستاویز کو کعبہ کے اندر جا کر کسی نے دیکھا ہی نہ تھا کہ اُس کا کیا حال ہے اور اسی لیے خود مشرکین کو اس کی اطلاع نہ تھی ظاہر ہے

کہ سوا غیبی ذریعہ کے رسولؐ کو اس واقعہ کے معلوم ہونے کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔ آپ نے جناب ابوطالب رضؓ سے بُلا کر اس واقعہ کا اظہار کیا تو اگر کوئی اور چچا ہوتا جس کے ایمان بالرسول میں ذرہ بھر بھی نقص ہوتا تو وہ بھتیجے سے جرح کرتا کہ آخر اس کی اطلاع تمھیں کیونکر ہوئی، مگر یہ تو حضرت ابوطالب رضوان اللہ علیہ تھے جن کا ایمان رسولؐ کی رسالت پر پہاڑوں سے زیادہ مستحکم تھا کہ اسی "تاریخ مسلمانان عالم" کی لفظوں میں:۔

> "ابوطالب فوراً قریش کے سرداروں کے پاس پہونچے اور کہا کیا یہ بات جو محمد بتلاتا ہے درست ہے۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو تمھیں فوراً اس کی مخالفت چھوڑ دینی چاہیے مگر برعکس اس کے اگر یہ غلط ہے تو میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ میں محمد کو تمھارے حوالہ کر دوں گا۔"

اس گفتگو سے بھی ظاہر ہے کہ یہ خبر کسی مادی ذریعہ سے پہونچی ہوئی نہ تھی ورنہ اس کی صحت معیارِ حقانیت کیونکر ہو سکتی تھی۔ نیز یہ بھی اس سے ظاہر ہے کہ جناب ابوطالب رضؓ جو رسولؐ کا ساتھ دے رہے تھے وہ فقط بھتیجے کی محبت میں نہیں بلکہ سچا رسول سمجھنے کی وجہ سے ورنہ اس اطلاع کے غلط ہونے کے مفروضہ پر جو اُن کے نزدیک فرض محال کی حیثیت رکھتا تھا وہ یہ نہ کہتے کہ "پھر میں بھی ساتھ چھوڑ دوں گا اور انھیں تمھارے حوالے کر دوں گا۔"

اب کیا ہوا؟ اسی مؤرّخ کی زبانی سُنئیے کہ:۔

”ابوطالبؓ مع سردارانِ قریش کعبہ میں پہونچے۔ وہاں عوام کثرت سے حکمنامہ کے دیکھنے کے لیئے جوق درجوق جمع تھے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ وہ واقعہ عین درست تھا اور رسولؐ اللہ کے نام کے حکم نامہ کا نام و نشان تک باقی نہ رہا تھا“

(مسلمانانِ عالم ج ۱ صـ۵۵-۵۶)

قدیم ترین مؤرّخ ابن سعد نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

ثمّ اطلع اللہ رسولہ علےٰ امر صحیفتہم وانّ الارضۃ قد اکلت (ما کان فیہا من جور و ظلم و بقی) ما کان فیہا من ذکر اللہ فذکر ذلک رسول اللہ صلعم لابی طالب فذکر ذلک ابو طالب لاخوتہ وخرجوا الی المسجد فقال ابو طالب لکفار قریش ان ابن اخی قد اخبرنی ولم یکذبنی قط ان اللہ قد سلّط علےٰ صحیفتکم الارضۃ فلحست

پھر اللہ نے اپنے پیغمبرؐ کو اُن کی دستاویز کے واقعہ کی اطلاع دی اور یہ کہ دیمک نے وہ تمام تحریر جس میں ظلم و ستم کی باتیں تھیں کھالی ہے اور جتنا حصہ ذکر الٰہی کا اُس میں تھا وہ باقی رہ گیا ہے۔ رسولؐ نے اس کا ابوطالبؓ سے ذکر کیا۔ اُنھوں نے فوراً اپنے بھائیوں کو بُلا کر اُن سے کہا اور یہ لوگ وہاں سے نکل کر مسجد میں آئے اور ابوطالبؓ نے کفار قریش سے کہا کہ میرے بھتیجے نے مجھے اطلاع دی ہے اور اُس نے کبھی مجھ سے کوئی جھوٹی بات نہیں کہی ہے کہ اللہ نے تمھاری دستاویز پر دیمک کو مقرر کیا اور اُس نے جو کچھ

ما کان فیها من جور او ظلم او قطیعة رحم وبقی فیها کل ما ذکر به الله فان کان ابن اخی صادقا نزعتم عن سوء رایکم وان کان کاذبا دفعته الیکم فقتلتموه او استحییتموه قالوا انصفتنا فارسلوا الی الصحیفة ففتحوها فاذا هی کما قال رسول الله صلعم فسقط فی ایدیهم ونکسوا علی رؤسهم فقال ابوطالب علام نحبس ونحصر وقد بان الامر ثم دخل هو واصحابه بین استار الکعبة والکعبة فقال اللّٰهم انصرنا ممن ظلمنا وقطع ارحامنا واستحل ما یحرم علیه منا۔

(طبقات ج ۱ ص ۱۴۱)

اُس میں ظلم و جور اور قطع رحم کی باتیں تھیں سب کو کھا لیا ہے اور بس جو ذکر الٰہی کا حصہ تھا وہ رہ گیا ہے۔ اب اگر میرا بھتیجا سچا ہے تو تمھیں اپنے غلط خیالات سے باز آنا چاہیے اور اگر اُس کی بات غلط نکلے تو میں تیار ہوں کہ اُسے تمھارے سپرد کر دوں۔ پھر چاہے تو اُسے قتل کر دو یا زندہ رکھو۔ اُن سب نے کہا یہ آپ نے بالکل انصاف کی بات کہی چنانچہ اُس دستاویز کے معائنہ کو آدمی بھیجے جنھوں نے جا کر اُسے کھولا تو دیکھا کہ بالکل اُس کی وہی کیفیت ہے، جو رسالتمآب نے بتائی تھی۔ اب تو وہ بالکل درماندہ ہو گئے اور اُن کی گردنیں جھک گئیں۔ جناب ابوطالب رضی نے کہا کہ آخر کس جرم پر ہمیں قید و بند میں رکھا جا رہا ہے جب کہ حقیقت بالکل کھل گئی ہے۔ اس کے بعد آپ اور آپ کے ساتھ کے آدمی کعبہ کے پردوں کے پیچھے جا کر کعبہ کی دیوار سے لپٹ گئے اور کہا خداوندا! ہماری مدد کر اُن کے مقابلہ میں جنھوں نے ہم پر ظلم کیا ہماری قرابت کے حقوق کو ضائع کیا اور جو سلوک ہمارے ساتھ انھیں روا نہ تھا اُسے روا رکھا۔

علامہ طبرسی لکھتے ہیں کہ وہ چالیسوں آدمی جن کی مُہریں اُس لپیٹی ہوئی دستاویز کو بند کر کے اُس پر لگائی گئی تھیں جمع ہوئے اور وہ دستاویز منگوائی گئی تو اُن میں سے ہر ہر شخص نے اپنی مہر کو دیکھا۔ وہ بالکل سالم تھی۔ ٹوٹی ہوئی نہ تھی۔ اس کے معنی یہ تھے کہ کسی شخص نے ان کے پہلے اُسے کھول کر دیکھ نہیں لیا ہے۔ پھر ان مُہروں کو توڑا گیا تو یہ دیکھا کہ سوا اسم و ذکر الٰہی کے اُس کے اندر کچھ بھی نہیں رہ گیا ہے۔ اب جناب ابوطالبؑ نے سب کو پکار کر کہا کہ ارے اللہ کا خوف کرو اور اب تو اس ظلم و ستم سے باز آؤ۔ سب خاموش رہے۔ کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس اتمام حجت کے بعد جناب ابوطالبؓ مع اپنے ساتھیوں کے پھر اپنے قلعہ میں واپس گئے۔ (اعلام الوریٰ)

ابن سعد لکھتا ہے کہ اب خود اُن میں پھوٹ پڑ گئی ایک جماعت جن میں سے مطعم بن عدی۔ عدی بن قیس۔ زمعہ بن اسود۔ ابوالبختری ابن ہاشم اور زہیر بن ابی اُمیّہ تھے کھڑی ہو گئی اور انھوں نے اس ظلم و ستم پر لعنت و ملامت شروع کر دی اور خود شعب ابی طالب میں جا کر بنی ہاشم و بنی مطلب سے کہا کہ بس اب تم لوگ باہر نکلو اور اپنے گھروں میں چل کر رہو چنانچہ یہ حضرات اُس محاصرہ سے باہر نکلے اور اپنے مکانوں پر آ رہے۔

اس وقت بعثت رسولؐ کا دسواں سال تھا۔

(طبقات ج ا ص ۱۴۰)

وفاتِ ابوطالبؓ

شعب ابی طالب کے شدائد سے نکل کر ابھی اچھی طرح اطمینان کی سانس لینے کا موقع نہ ملا تھا کہ غالبًا انہی سختیوں اور زحمتوں کے نتیجہ میں جو تین سال تک ان محصورین نے برداشت کی تھیں صرف دو ہی مہینے کے بعد[1] بعثت کے دسویں سال ۱۵ ر شوال[2] کو حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے انتہائی شفیق اور جاں نثار چچا جناب ابوطالب رضوان اللہ علیہ نے دنیا سے رحلت فرمائی۔ آپ کی عمر اس وقت کچھ اوپر اسّی برس کی تھی[3]۔

تاریخ اسلام کے اس دس برس کے کافی طویل دور کا مطالعہ کرنے والوں کو جنھیں اس دور میں اسلام حضرت محمد مصطفٰےؐ اور جناب ابوطالب سب کا نام ہر ہر منزل پر ساتھ ساتھ نظر آیا ہے کیا یہ تصور بھی ذہن میں آنا چاہیے کہ اب جب جناب ابوطالبؓ دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں تو اسلامی تاریخ میں کوئی مواد ایسا آجائے گا جو اس حامی و محافظ اسلام کو اسلام کے احاطے سے ابدالآباد تک کے لیے خارج کر دے، مگر برا ہو سیاست ملوکانہ کے اس تقاضے کا جس نے جمہور امت اسلامی کی تاریخ، حدیث اور تفسیر سب ہی کو متاثر بنا کر رکھ دیا ہے، جس کے ماتحت حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی سبقت ایمانی اور جناب ابوطالبؓ کی خدماتِ اسلامی کے اثر کو ختم کرنے کے لیے جناب ابوطالبؓ کے دنیا سے اٹھنے کے

---

[1] اعلام الوریٰ طبرسی رحمہ اللہ [2] ابن سعد ج ۱ ص ۹۰ [3] اسد الغابہ ج ۱ ص ۲۹

موقع کے لیئے یہ حدیث وضع کرلی کہ جناب رسالت مآبؐ اُن کے پاس تشریف لائے اور اُن سے فرمایا کہ وہ کلمہ پڑھ لیں مگر اُنھوں نے اس سے انکار کر دیا۔"

اب اس کے بعد پھر بنی اُمیّہ کے کاسہ لیس وضّاعین وکذّابین نے اس میں کیا کیا شاخسانے پیدا کیے ہیں کہ رسولؐ اس کے بعد ابو طالبؓ کے لیئے عرصہ تک استغفار کرتے رہے مگر خدا نے آپ کو اس سے منع فرمایا اور رسولؐ نے معاذ اللہ مسلمانوں کو اُن کے دوزخ میں ہونے کی اطلاع دی۔

یہ سب احسان فراموش روایتیں اب اُس دور کے لیئے ہیں جب کہ جناب ابو طالبؓ کی پوری زندگی اسلام کی خدمت میں بسر ہو چکی حالانکہ خود اہل سنت کے محدثین نے اس موقع پر عم رسولؐ جناب عباسؓ کی شہادت نقل کی ہے جسے شاہ عبدالحق محدّث دہلوی نے ان الفاظ میں لکھا ہے:۔

> "می آرند کہ عباس سر خود را نزد او برد و شنید از وے کلمۂ شہادت را وبحضرت برسانید پس گفت اسلم عمّک یا رسول اللہ پس خوش حال شد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم"
>
> (مدارج النبوة)

مگر ہمارے نزدیک درایتی طور پر یہ رسولؐ کی دعوت و تبلیغ کی پوری حکایت سیاست بنی امیہ کی پیداوار ہے۔

جب کہ عام اصول تبلیغ و دعوت کی بنا پر عقلاً بھی اور نص قرآنی کی بنا پر نقلاً بھی جناب رسالت مآبؐ کا فریضہ یہ تھا کہ آپ پہلے گھر والوں کو تبلیغ فرماتے۔ پھر گھر لانے والوں کو — پھر تمام دنیا کو تو آخر آپ نے اپنے

چچا کو کلمہ پڑھوانے کے لئے یہ دس برس کا کیوں انتظار فرمایا کہ جب وہ دنیا سے جانے لگیں اُس وقت حضرتؐ اُن کے سامنے اس پیغام کو پیش فرمائیں۔

کیا معاذ اللہ وہ رسولؐ جسے کافر تک صادق وامین سمجھتے تھے، اُن محدثین کے زعم میں معاذ اللہ ابن الوقت سیاست دانوں کی طرح تھا کہ آپ نے خیال فرمایا کہ ابھی ان سے رشتہ داری وغیرہ کی محبت میں جتنا کام نکلتا ہے وہ نکالا جائے اور کلمہ پڑھنے کی بات نہ لائی جائے۔ ورنہ کہیں یہ بھڑک نہ جائیں اور یہ رہی سہی امداد جو مل رہی ہے چلی نہ جائے تو مصیبت ہوگی۔ اس لئے اُن کے بچوں کو کلمہ پڑھوا دیا۔ اپنی چچی جناب فاطمہ بنت اسد کو کلمہ پڑھوا دیا۔ دوسرے عزیزوں کو تبلیغ کردی مگر اُن سے کہنے کی معاذ اللہ ہمت نہ ہوئی کہ چچا آپ بھی کلمہ پڑھ لیجئے ـــــ یہاں تک کہ اب جب کہ اُن سے جو کچھ امداد ملنا تھی وہ مل چکی اور اُن کا دم واپسیں ہوا تو اب آپ نے کھُل کر اُن کے سامنے اسلام کا پیغام پیش کیا اور اب انھوں نے اُسے قبول نہ کیا تو آپ نے اب خفا ہو کر معاذ اللہ اُن کے دوزخی ہونے کی خبریں سُنانا شروع کردیں ـــــ؟ کیا مسلمان اپنے رسولؐ کے کردار کو ایسا ہی سمجھنے اور سمجھانے پر آمادہ ہیں؟!

اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً ایسا نہیں ہے تو پھر کسی ضعیف سے ضعیف ہی روایت میں سہی ہمیں ملنا چاہیئے کہ جناب رسالت مآبؐ نے اس کے پہلے بھی کبھی اپنے چچا کو دعوت دی ہو کہ وہ کلمۂ اسلام زبان پر

جاری کریں۔

ایسا نہیں ہے، اور جہاں تک ہمارا مطالعہ ہے یقیناً ایسا نہیں ہے اور درایۃً کبھی ایسا نہیں ہوا اس لیے کہ ایسا ہوا ہوتا تو پھر جناب رسالتمآبؐ کو اپنے چچا کی طرف سے البغضُ فِی اللہ کے ماتحت بھی جو حق پرستی کا لازمی نتیجہ ہے اور ایک ایسے مُربّی اور قریب ترین محبّت کا رشتہ رکھنے والے کی طرف سے ایک ایسے دل شکن جواب کو سُن کر نفسیاتی طور سے جو قلب پر اثر ہونا چاہیے اُس کی بنا پر بھی، اتنا صدمہ پہونچنا چاہیے تھا کہ آپ پھر اُن کی ہر قسم کی امداد اور تعاون کی پیش کش اور اُن کی سرپرستی کی پناہ کو ترک کرنے پر آمادہ ہو جاتے۔ کم از کم اس کی وجہ سے گھر کے اندر کسی خلفشار کا پتہ چلنا چاہیے تھا۔

اور کچھ آپس میں تعلقات میں کشیدگی ظاہر ہونا لازم تھی مگر دس برس تمام تبلیغ اسلام کے کٹھن سے کٹھن مراحل پوری یکجہتی اور تعاون کے ساتھ گزرے اور کسی قسم کی باہمی رنجش کا اثر ذرّہ بھر بھی پیدا نہیں ہوا — یہ خود اس کا ثبوت ہے، کہ رسولؐ اُن کے طرزِ زندگی سے مطمئن تھے اور جو کچھ وہ کہتے اور کرتے تھے اُسے حضرتؐ اُن کے اسلام و ایمان کے ثبوت کے لیے کافی سمجھتے تھے۔ پھر اب ایک دم اُن کے عالم احتضار میں یہ کیا ہو گیا کہ حضرتؐ کو انھیں کلمہ پڑھوانے کی فکر پیدا ہو گئی اور اس کے بعد سے ان محدّثین اور مورخین کو وہ اُن کے معاذ اللہ دوزخی ہونے کی بشارتیں سُنانے لگے۔

شہد اللہ ورسولہ کہ یہ اُن اَخلافِ سُوء کا افترا و بہتان ہے جنھیں اپنے اسلاف کے دوزخی ہونے کے یقین نے اس پر آمادہ کیا ہے کہ وہ اولادِ علیؑ وفاطمہؑ کو بھی اُن کے مورثِ اعلیٰ کے حسنِ انجام کے فخر سے ان موضوعہ حدیثوں کے سہارے سے محروم کردیں۔ اس طرح کم سے کم اس منزل میں اُن کو اپنے برابر لے آئیں۔

حقیقت امر وہی ہے جس پر پہلے بھی جناب ابوطالبؓ کے موقف کی تشریح میں تبصرہ ہو چکا ہے کہ اُن کا ایمان مابین خود و خدا مُسلّم تھا۔ جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اُس سے واقف تھے۔ گھر کے سب آدمی اُسے جانتے تھے۔ اسی لیے باہم کوئی کشمکش نہ تھی۔ کوئی اقرار وانکار کی صورت نہ تھی۔ کوئی رنجش اور کشیدگی نہ تھی۔ جو اُن کا طرزِ عمل تھا وہی خدا اور رسولؐ کی طرف سے اُن کا فریضہ تھا جسے اُنھوں نے باحسنِ وجوہ پایۂ تکمیل تک پہونچایا اور اسی راہ پر دنیا سے رخصت ہوئے جس کے بعد اُن کے سامنے کسی منزل پر بھی اب اسلام کو پیش کرنے اور اُن سے اقرار لینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جناب ابوطالب کچھ بیمار نہ تھے کہ جناب رسالت مآبؐ کو اُن کی بیماری کی اطلاع دی جاتی۔ وہ تو محاصرہ کے شدائد سے اب ضعیف اتنے ہو گئے تھے کہ اُن کی زندگی نے ایک دم ساتھ چھوڑ دیا۔

قدیم ترین مورخ ابن سعد کاتب واقدی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت جناب رسالت مآبؐ اُن کے پاس موجود نہ تھے۔ اُنھوں نے

اس وقت جو اعزہ موجود تھے اُنھیں پاس جمع کیا اور حضرت پیغمبرؐ خدا کے اتّباع و نصرت کی وصیت کی۔

ابن سعد کے الفاظ یہ ہیں:۔

انّ ابا طالب دعا بني عبد المطّلب فقال لن تزالوا بخير ما سمعتم من محمّد و ما اتّبعتم امره فاتّبعوه و اعينوه ترشدوا۔

اس وقت ابوطالب نے اولاد عبد المطلب کو بلایا اور کہا تمھارے لیے ہمیشہ بھلائی ہی بھلائی رہے گی جبتک محمدؐ کی بات مانتے رہو گے اور جبتک اُن کے دین کی پیروی کرتے رہو گے اُن کی پیروی اور اُن کی مدد کرتے رہنا تو تم کامیاب کامران رہو گے۔

حضرت علی ابن ابی طالبؑ کا بیان ہے کہ:۔

اخبرت رسول اللہ ص بموت ابي طالب فبكى ثم قال اذهب فاغسله و كفّنه و واره غفر الله له و رحمه۔

میں نے جا کر رسولؐ خدا کو ابوطالبؑ کی وفات کی اطلاع دی تو حضرتؐ نے گریہ فرمایا پھر کہا کہ جاؤ انھیں غسل دو کفن پہناؤ اور دفن کر دو اللہ اُن کی مغفرت کرے اور اپنی رحمت شامل حال فرمائے۔

یہی موقع ہے کہ غسل مسّ میت کا حکم بھی جو فقہ جعفری میں آج تک قائم ہے۔ حضرت پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زبان مبارک پر آیا۔

چنانچہ ابن سعد نے لکھا ہے:۔

قال علیؑ وامرنی رسول اللہ فاغتسلت۔ (طبقات ابن سعد ج ا صـ ۸۳)

حضرت علیؑ کا بیان ہے کہ پھر حضرتؐ نے مجھ کو حکم دیا اور میں نے غسل کیا۔

ایک غلط فہمی جو یہاں پر ہو سکتی ہے اُسے علامہ ابن اثیر جزریؒ نے اس واقعہ کے تذکرہ کے بعد دُور کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:—

توفی ابو طالب وکان عمرہ بضعا وثمانین سنۃ ثم توفیت بعدہ خدیجۃ ولم تکن الصلوٰۃ علی الجنائز یومئذ۔

(اسد الغابہ ج ا صـ ۱۹)

جناب ابو طالبؓ کی وفات ہو گئی۔ اس وقت اُن کی عمر کچھ اوپر اسّی برس کی تھی، پھر اُن کے بعد جناب خدیجہ کی وفات ہوئی۔ اُس وقت تک شریعت اسلام میں نماز جنازہ کا قاعدہ جاری نہیں ہوا تھا۔

علامہ طبرسی نے تحریر فرمایا ہے کہ جناب رسالتمآبؐ نے حضرت علیؑ کو غسل وکفن کا حکم دینے کے بعد فرمایا:—

فاذا رفعتہ علی سریرہ فاعلمنی ففعل ذلک فلما رفعہ علی السریر اعترضہ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ۔ (اعلام الوریٰ)

غسل وکفن کے بعد جب جنازہ اُٹھانے لگنا تو مجھے اطلاع کر دینا چنانچہ حضرت علیؑ نے اس کی تعمیل کی اور جب جنازہ اُٹھایا گیا تو جناب رسالتمآبؐ تشریف لا کر مشایعت جنازہ میں شریک ہوئے۔

جناب ابو طالبؓ کو مکہ معظمہ کے قبرستان میں جو جنۃ المعلیٰ کہلاتا ہے حضرت عبد المطلبؓ وغیرہ کے قبور کے قریب دفن کیا گیا۔

ابن سعود نے مدینہ کی جنۃ البقیع ہی کی طرح اس جنۃ المعلّٰی کو بھی مسمار کردیا۔ اس کے پہلے تک یہ مقابر اہل اسلام کی زیارت گاہ تھے۔

وفات خدیجہ کبریٰؓ

ابھی جناب ابو طالبؓ کا غم بالکل تازہ ہی تھا کہ دوسرا سانحہ رونما ہوا کہ حضرت پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی انتہائی وفادار شریکۂ حیات جناب خدیجۂ کبریٰؓ نے بھی کہ جنھوں نے آپ کے مشن کی خاطر اپنی پوری دولت قربان کردی اور طرح طرح کی سختیاں اور مصیبتیں جھیلیں دنیا سے رحلت فرمائی۔

ایک ضعیف روایت تو یہ ہے کہ اُن کی وفات شعب ابی طالب سے نکلنے کے بعد پہلے ہوئی اور پھر ایک سال کے بعد جناب ابو طالبؓ کی رحلت ہوئی۔ (اعیان الشیعہ ج ۲ ص ۱۰۲)

مگر زیادہ تر روایات یہی بتاتے ہیں کہ جناب ابو طالبؓ کے بعد جناب خدیجہؓ کا انتقال ہوا مگر کتنا بعد؟ اس میں پھر اختلاف ہے۔

ابن سعد کا بیان ہے کہ جناب ابو طالبؓ کی وفات ۱۵ر شوال کو ہوئی اور جناب خدیجہؓ اس کے ایک مہینے پانچ دن بعد دُنیا سے اُٹھیں۔ (طبقات ج ۱ ص ۱۴۱)

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ۲۰ر ذیقعد کو اُن کی وفات ہوئی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ وہ جناب ابو طالبؓ کے بعد صرف تین۳ دن زندہ رہیں۔

اور تین دن کے بعد اُن کی وفات ہوگئی۔ (اعلام الوریٰ طبرسی رحمۃ اللہ)

زیادہ تر مورخین کی اس تعبیر سے کہ توفّیا فی عام واحد "ان دونوں آدمیوں کی وفات ایک ہی سال میں ہوئی" پہلے قول کو زیادہ قوت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اگر اُن کی وفات صرف تین دن بعد ہوئی ہوتی تو اُس کے لیے "ایک سال کے اندر" نہ کہا جاتا بلکہ "ایک ہفتہ" کے اندر کہا گیا ہوتا — "ایک سال کے اندر" کہنا بتلاتا ہے کہ ہفتہ بھی ایک نہ تھا اور مہینہ بھی ایک نہ تھا بلکہ سال ایک ہی تھا — یہ پہلے قول پر منطبق ہوتا ہے دوسرے پر نہیں۔

ابوالفرج اصفہانی نے لکھا ہے کہ جناب خدیجہ مقام "حجون" میں دفن ہوئیں۔ (مقاتل الطالبیین صفحہ ۳۲)

عربی ادب سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقام حجون صفا کے مقابل میں مکّہ کی آبادی کا دوسرا سرا تھا جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:-

کان لم یکن بین الحجون الی الصفا   انیس ولم یسمر بمکّۃ سامر

فعلاً مزار جناب خدیجہ جنۃ المعلّٰی سے ذرا فاصلہ پر موجود ہے جسے ابن سعود کی حکومت نے مثل اور مزارات کے ویران بنا رکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حجون کا مقام انہی اطراف میں تھا کہ جہاں جنۃ المعلّٰی کا مقبرہ تھا۔

اُن سانحوں کا اثر

جناب ابوطالبؓ اور جناب خدیجہ رضوان اللہ علیہما ان دونوں

بزرگواروں کی وفات کا جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کیا اثر پڑا؟ وہ اس سے ظاہر ہے کہ

سمّٰی رسول اللہ صلے اللہ علیہ واٰلہ ذٰلک العام عام الحزن۔ (اعلام الوریٰ)

جناب رسالتمآبؐ نے اس سال کا نام "عامُ الحُزن" (غم و رنج کا سال) رکھ دیا۔

ابن سعد کا بیان ہے کہ

اجتمعت علٰے رسول اللہ صلعم مصیبتان فلزم بیتہ واقل الخروج و نالت منہ قریش ما لم تکن تنال ولا تطمع بہ۔

(طبقات ج ۱ ص ۱۴۱)

پیغمبر خداؐ پر دو مصیبتیں جمع ہو گئیں جس کے بعد آپ گوشہ نشین ہو گئے۔ گھر سے نکلنا بہت کم کر دیا اور اب قریش آپ کو وہ ایذائیں پہونچانے لگے جو اس کے پہلے نہ پہونچاتے تھے اور جن کا وہ تصور بھی نہ کرتے تھے۔

سفر طائف

جناب ابوطالبؑ کے بعد مکّہ کی سرزمین کا ہر چپہ پیغمبر خداؐ کے لیے خارزار بن گیا تھا اور مشرکین کی ایذا رسانی میں ایک دم انتہائی شدت ہو گئی تھی۔ آپ نے چاہا کہ کچھ دن کے لیے ان کی نظر سے اوجھل ہو جاؤں جس سے یہ ان کا وقتی جوش مخالفت کچھ کم ہو جائے اور کچھ اسلامی پیغام کی تبلیغ کے حلقہ میں وسعت بھی پیدا ہو جائے — کہیں تو ایسے آدمی ملیں گے جن میں

قبولِ حق کی صلاحیت ہو اور جو ایسے نہ ہوں گے اُن پر بھی حجّت تو تمام ہو جاوے گی۔ چنانچہ آپ جناب زید بن حارثہؓ کو اپنے ساتھ لے کر طائف کی طرف روانہ ہوئے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ

ذٰلک فی لیال بقین من شوال سنة عشر من حین نبئ رسول اللہ صلعم

ماہ شوال کی آخری تاریخوں میں بعثت سے دسویں برس کا یہ واقعہ ہے۔

اب جیسا کہ پہلے بیان ہوا جناب ابو طالبؓ کی وفات چونکہ ۱۵ شوال کو ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی وفات کے ایک ہی ہفتہ کے بعد حضرتؐ نے یہ سفر اختیار فرمایا ہے۔ اور اگر وہی روایت درست سمجھی جاوے جسے ہم ترجیح دے چکے ہیں کہ جناب خدیجہؓ کی وفات جناب ابو طالبؓ سے ایک مہینے پانچ دن کے بعد ہوئی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سفرِ طائف کے موقع تک جناب خدیجہ کبریٰؓ بقیدِ حیات تھیں اور ظاہر ہے کہ آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہراؑ ابھی موجود تھیں تو اس سے یہ راز سمجھ میں آجاتا ہے کہ آپ اس سفر میں حضرت علی بن ابی طالبؑ کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گئے اور جناب زید بن حارثہ ہی کو کیوں لے گئے؟ حضرت علیؑ کو حرمِ نبوّت اور حریمِ رسالت کی حفاظت کے لیے گھر پر چھوڑنا ضروری تھا۔ اس کے بعد زید بن حارثہؓ ہی وہ وفادار بیٹے کی طرح پلے ہوئے غلام خاص تھے جنھیں آپ اپنے ساتھ لے جا سکتے تھے۔ اور لے گئے۔

پھر یاد کر لیجیے کہ جس طرح شعب ابی طالب کے تین برس کے محاصرہ میں سابقین الی الاسلام کی فہرست میں بڑے بڑے داخل کیے جانے والوں میں سے ایک فرد کا بھی نام نظر نہیں آیا ہے۔ اسی طرح اب محاصرہ سے نکلنے کے بعد اس شدت مصیبت و ابتلاء کے ہنگام میں بھی تاریخ اسلام میں دور دور تک چاہے کسی کے قلم کی لکھی ہوئی تاریخ ہو، کسی بزرگوار، دوست اور وفادار یا جاں نثار کا نام نظر نہیں آتا ہے — یہ سب نام تو آپ کو اس وقت سے دکھائی دیں گے جب سے حالات سازگار ہونا شروع ہوں گے اور ذرا غلبہ و اقتدار کی امیدیں پیدا ہوں گی۔ اب اپنی قدامت کے بلند بانگ دعوے کرنے والے بہت سے آگے بڑھ کر سامنے آجائیں گے مگر ابھی تو پھولوں کی سیج نہیں۔ کانٹوں کے انبار ہیں سونے چاندی کے سکے نہیں آگ کے انگارے — اس وقت تو اسلام صرف "داشتہ آید بکار" کے طور پر اختیار کر لیا گیا ہے — مگر ابھی جانبازی و جاں نثاری کے ساتھ اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کا موقع تھوڑی ہے!!

طائف مکہ معظمہ کے قریب اس وقت اور آج بھی ایک سرسبز خطہ ہے جہاں کے میوے مشہور رہے ہیں "تاریخ مسلمانان عالم" میں ہے۔

"طائف مکہ سے تقریباً ساٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں کے باشندے جفاکش اور محنتی واقع ہوئے تھے"

جناب خواجہ محمد لطیف صاحب لکھتے ہیں کہ

"طائف مکہ سے چالیس میل کے فاصلہ پر ایک بارونق اور زرخیز

بستی ہے۔" (اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ جلد اول صفحہ ۶۶)

علامہ طبرسی کا بیان ہے کہ وہاں قبیلۂ ثقیف کا مستقر تھا۔

(اعلام الوریٰ)

طائف میں حضرتؐ نے دس دن قیام فرمایا اور فرداً فرداً وہاں کے ہر خاص آدمی سے بات کی۔ مگر وہ لوگ پیغامِ حق کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے اس اندیشہ سے کہ کہیں ہمارے نوجوانوں کے دل و دماغ پر ان کے خیالات کا اثر نہ ہو جائے صاف صاف آپ سے کہا کہ آپ ہمارے ملک سے چلے جائیں اور کہیں اور جا کر قیام کریں — اتنا ہی نہیں بلکہ اپنے جاہلوں اور اوباشوں کو آپ کی ایذا رسانی کے لیے اُبھار دیا۔ اور وہ لوگ آپ کو پتھر مارنے لگے۔ زید بن حارثہؓ اکیلے ان پتھروں سے آپ کی سپر بنتے تھے۔ چنانچہ اُن کے سر میں بہت زخم آ گئے اور حضرت رسولؐ خدا کی ٹانگوں سے خون جاری ہو گیا۔

اس حالت میں آپ طائف سے رخصت ہو کر مکہ کی جانب واپس ہوئے، مگر عالم یہ تھا کہ اب حرمِ خدا میں بھی آپ کے لیے کوئی جائے پناہ نہ تھی — آپ کوہِ حرا تک پہونچے تو آپ نے عرب دستور کے مطابق مطعم بن عدی کو جو جناب ابو طالبؓ کے قدیم دوستوں میں سے تھا پیغام بھیجا کہ میں تمہاری پناہ میں آنا چاہتا ہوں۔ مطعم کو پُرانے تعلقات کی مروت آ ئی۔ اُس نے اقرار کر لیا اور اپنے اولاد و اعزائے خاص سے

کہا کہ تم سب ہتھیار لگا لو۔ میں نے محمدؐ کو اپنی پناہ میں لے لیا ہے۔ چنانچہ وہ سب خانۂ کعبہ کے آس پاس آ گئے، جس کے بعد حضرتؐ مع زید بن حارثہ کے مسجد حرام میں داخل ہوئے۔ مطعم بن عدی نے کھڑے ہو کر سارے قریش کو آگاہ کیا کہ خبردار محمدؐ کو کوئی تکلیف نہ پہونچانا۔ وہ اس وقت میری پناہ میں ہیں۔ سب کی نظروں کے سامنے حضرتؐ رُکن کے پاس تشریف لائے۔ اُس کا استلام کیا، دو رکعت نماز پڑھی اور پھر مطعم بن عدی اور اُس کی اولاد و اعزا کے حلقے میں اپنے گھر کے دروازے تک آئے اور اندر داخل ہوئے۔ (طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۴۲)

مصائب کی شدّت
اور
دائرۂ اسلام کی وسعت

حضرت پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو جسمانی آزار رسانیوں کے جتنے واقعات ہیں، جیسے پتھروں کی بارش، اور سر مبارک پر خس و خاشاک کا پھینکا جانا۔ یہ سب اسی دور سے متعلق ہیں جب کہ جناب ابو طالبؑ کا سایہ سر سے اُٹھ چکا تھا۔ مگر یہ اس بزرگ مرتبہ داعیِ حق کا صبر و استقلال تھا کہ چچا کی وفات کے بعد بس چند روز گوشہ نشینی اختیار کی۔ پھر طائف کے سفر کا تلخ تجربہ کیا جس کے بعد مطعم بن عدی سے پناہ حاصل کر کے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ اس غرض سے کہ اپنے

خالق کے گھر کے پاس دو رکعت نماز آزادی سے پڑھ لیں مگر جانتے تھے کہ میں پناہ لینے کے لیے دنیا میں نہیں ہوں بلکہ گمراہیوں کے سیلاب میں ڈوبتی ہوئی دنیا کو اپنے سایۂ رحمت میں پناہ دینے کے لیے ہوں —— مطعم بن عدی کی پناہ اگر قائم رہی تو میری زندگی تو محفوظ ہو جائے گی مگر میں کام نہیں کر سکوں گا۔ یہ پناہ میرے لیے سنگ راہ ثابت ہو گی۔ اس لئے آپؐ نے مکان پر پہونچ کر مطعم بن عدی کا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا بس اب آپ کی ذمہ داری ختم ہوئی۔ اب آپ مجھے اپنی پناہ کے بارے سبکدوش کیجئے۔ اس کے بعد آپ، مکہ کی گلیوں میں جب نکلتے تھے تو جہاں تک موقع ملتا تھا علی بن ابی طالبؑ آپ کے ساتھ رہتے تھے مگر علیؑ بھی کرتے کیا۔ ابھی حضرت رسول خداؐ کے لئے یہ مصلحت پروردگار تو تھی ہی نہیں کہ یہ ذرہ بھر بھی مادی طاقت کو کام میں لا کر کسی کا مقابلہ کریں۔ یہ خونِ شباب کے روز افزوں جوش و خروش کے عالم میں علیؑ کے صبر و ضبط کا بڑا امتحان تھا مگر وہ جانتے تھے اس وقت اُن کا جہاد اسی میں ہے کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے کہ کافر ہم پر بدامنی پیدا کرنے کا الزام عائد کر سکیں اور اکثر حضرت علی بن ابی طالبؑ اور زید بن حارثہؓ کا بھی اگر گھر کے ضروریات کی بنا پر آپ کے ساتھ ہونا ممکن نہ ہوتا تھا تو آپ تن تنہا راستوں سے گزرتے تھے۔ اس وقت مشرکین کی ہمت اور زیادہ ہوتی تھی اور دل کھول کر تکلیفیں پہونچاتے تھے مگر آپ کا یہ عالم کہ اکثر سر اُٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔ مُڑ کر نظر بھی نہ کرتے اور کسی مقابلہ کا ذکر کیا

کسی کے لیے کوئی کلمۂ سخت بھی نہ کہتے اور بددُعا بھی نہ کرتے مگر جب موقع ملتا تو پیغام حق کے سُنانے سے لب بھر کبھی خاموش نہ کرتے۔ خصوصیت کے ساتھ جب موسمِ حج آتا تھا اور لوگوں کے ہتھیار نیاموں میں چلے جاتے تھے تو آپ ادھر اُدھر سے آنے والے قبائل کے خیموں میں جاتے اور ہر ایک کو دعوتِ حق دیتے، اور اپنی نصرت وحمایت پہ آمادہ کرتے مگر نتیجہ کیا تھا؟ اس کے متعلق ابن سعد کے الفاظ یہ ہیں:—

فلیست قبیلة من العرب تستجیب له و یؤذی ویشتم۔	عرب کا کوئی قبیلہ آپ کی دعوت پر لبیک نہیں کہتا تھا بلکہ آپ کو آزار پہونچایا جاتا تھا اور گالیاں دی جاتی تھیں۔

مگر آخر اس حُسنِ کردار، اس ثباتِ قدم، اس صبر واستقلال کا اثر کہاں تک نہ ہوتا۔ ایک طرف خود مکّہ والوں میں بہت سوں کے ضمیر میں یہ احساس پیدا ہونا لازمی تھا کہ ایک تنِ تنہا شخص جس سے اب اپنے چچا کا بھی سہارا قطع ہو گیا ہے اُسے ہر طرح کی تکلیفیں پہونچائی جاتی ہیں اور وہ اپنی بات سے نہیں ہٹتا۔ اس بات میں تو کوئی وزن ہے ہی — اُن میں سے بہت سوں کے اندرونی احساسات کا کچھ تجزیہ ایک صاحبِ قلم نے اچھے الفاظ میں اس طرح کیا ہے کہ:—

"اُن میں سے اکثر دل ہی دل میں کہتے تھے کہ اس شخص کے خیالات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کے اصول جو بھی ہوں، ہوں۔

وہ پاکباز۔ راست باز اور مخلص ضرور ہے۔ بچپن سے اس نے ایسا کوئی فعل نہیں کیا جو قابل اعتراض ہو۔ وہ زندگی کے اسرار کو خوب جانتا ہے۔ وہ حیات بعد الممات سے کماحقہٗ واقف ہے۔

کہا جاتا ہے کہ خیالات کا اثر طبیعت پر ضرور پڑتا ہے۔ لوگوں میں جب یہ خیالات پیدا ہوئے تو انھوں نے رسولؐ خدا کی تقریروں کو غور سے سُنا۔ جوں جوں وہ خدا کا پیغام سُنتے۔ اُن کی تڑپ زیادہ بڑھتی۔ وہ جو جابر۔ ظالم اور مفسد تھے۔ اُن کے دل نرم پڑ گئے اور وہ جو مایوس اور مفلوک الحال تھے۔ اُن کے قلب کو بہت زیادہ تسکین ہو گئی۔"

(مسلمانان عالم جلد اول صفحہ ۵۹-۶۰)

مگر عوام کے یہ بڑھتے ہوئے احساسات اور تصوّرات بھی اُن خاص با اقتدار اشخاص کو جنھیں آپ کے مشن کی کامیابی سے اپنے مفادات کو خطرہ محسوس ہوتا تھا آپ کے خلاف عناد میں اور شدت پیدا کرنے کے باعث بنتے تھے۔

یثرب کے نصیب کی بیداری

"جوئندہ یابندہ" وہ داعی حق جو طلبگارانِ حق کی تلاش میں تھا وہ ابرِ بہاراں جو پیاسوں کی جستجو میں ہر طرف حیران و پریشان

پھر رہا تھا اور وہ ہاتھ تھامنے والا جو اس فکر میں سرگرداں تھا کہ کوئی اُس کا سہارا لینے پر تیار ہو جائے۔ آخر کچھ ایسے طلبگار، ایسے پیاسے اور ایسے سہارا لینے والے پا ہی گیا۔

ابن سعد کے الفاظ یہ ہیں:—

حتّٰی اراد اللّٰہ اظہار دینہ ونصر نبیہ وانجاز ما وعدہ فساقہ الی ھذا الحی من الانصار لمّا اراد اللّٰہ لھم من الکرامۃ۔

طبقات ابن سعد
جلد اول صفحہ ۱۴۶

وہ وقت آ گیا کہ اللّٰہ کی مشیت مقتضی ہوئی کہ وہ اپنے دین کو نمایاں کرے، اپنے رسولؐ کی امداد کرے اور اپنے وعدے کو پورا کرے تو اُس نے آپ کو انصار کے اس گروہ تک پہونچا دیا جسے اس عزت سے سرفرازی عطا کرنا اُس نے نصیب میں لکھ دیا تھا۔

اب کا "مدینہ منورہ" اُس وقت یثرب کہلاتا تھا اور یہاں حضرت پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ننھیال تھی۔ یہاں کے دو طاقتور قبیلے اوس و خزرج تھے جو بُت پرستی میں مصروف تھے اور آپس میں سخت جنگ و جدال بھی کرتے رہتے تھے۔ بہت سے یہودی یہاں مدت دراز سے بسے ہوئے تھے جنھوں نے اپنے بزرگوں سے جو توریت کے مندرجات سے واقف تھے، پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ظاہر ہونے اور اس سرزمین پر آ کر قیام فرمانے کی بشارتیں سُنی تھیں اور وہ ان قبائل اوس و خزرج کے سامنے اُس کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔

کہ دیکھو آخری رسولؐ جب اس شہر میں آئے گا تو تمھاری سب بُت پرستی ختم ہو جائے گی اور تمھیں ہمارے سامنے سرِ اطاعت خم کرنا پڑے گا۔ ان لوگوں کی ان خبروں سے اہلِ مدینہ کے ذہن میں بھی اس رسولؐ کی آمد کا ایک تصوُّر پیدا ہو گیا تھا۔

حضرت پیغمبر خداؐ تو موسمِ حج میں ہر ایک نو وارد قبیلہ کے پاس پہونچنے کی کوشش فرماتے ہی رہتے تھے۔ اس ذیل میں کچھ یثرب سے آنے والے افراد کی طرف بھی پہونچ گئے جو اس وقت اپنے سر مُنڈوا رہے تھے ۔۔ ابن سعد لکھتا ہے :۔

فجلس الیھم فدعاھم الی اللہ وقرأ علیھم القرآن فاستجابوا للہ ولرسولہ واسرعوا وآمنوا وصدقوا۔

طبقات ابن سعد

آپ اُن کے پاس بیٹھ گئے اور انھیں اللہ کی طرف دعوت دی اور قرآن پڑھ کر سُنایا جس پر اُن سب نے اللہ اور رسولؐ کی دعوت پر لبیک کہی اور فوراً ایمان لائے اور تصدیق پر آمادہ ہو گئے۔

پھر یہی لوگ مدینہ گئے اور اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دی جسے بہت سوں نے قبول کر لیا۔ یہاں تک کہ انصار کا کوئی گھر ایسا نہ رہا جس میں حضرت رسول خداؐ کا چرچا نہ ہو۔

مؤرخ ابن سعد نے قالوا کی لفظ سے کچھ لامعلوم مؤرخین کی طرف نسبت دے کر لکھا ہے کہ اہلِ مدینہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والے

اسعد بن زرارہ اور ذکوان بن عبد قیس تھے ۔ واقعہ یہ تھا کہ یہ اسعد بن زرارہ اور ابو الہیثم بن تیہان یثرب میں دو ایسے شخص تھے جو اپنی عقل سلیم کی رہنمائی سے خدا کے لا شریک ہونے کے متعلق آپس میں گفتگو کیا کرتے تھے ۔ اب یہ دونوں ایک باہمی جھگڑے کے سلسلہ میں مکہ میں عتبہ بن ربیعہ کے پاس گئے تو عتبہ نے کہا کہ آج کل تو ہمارے لیے یہ شخص جو اُدھر نماز پڑھ رہا ہے ایک مصیبت بن گیا ہے جس کی وجہ سے کسی اور بات کی فرصت ہی نہیں ہے ۔ اُس کا دعویٰ ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے اور اس اس طرح کی باتیں کرتا ہے ۔ عتبہ سے یہ ذکر سن کر یہ لوگ اُٹھے تو ذکوان نے اسعد سے کہا کہ لو یہ تو وہی دین ہے جس کے متعلق تم اپنا خیال ظاہر کیا کرتے ہو اور اس طرح یہ دونوں رسولؐ کی خدمت میں گئے ۔ آپ نے اُن کے سامنے اُصولِ اسلام کو پیش فرمایا اور دونوں نے اسلام قبول کیا ۔ پھر یہ دونوں مدینہ واپس ہوئے تو اسعد نے ابو الہیثم بن تیہان سے ملاقات کی اور پورا واقعہ بیان کیا جسے سن کر ابو الہیثم نے کہا کہ میں بھی تمہارے ساتھ یہ گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں ۔ اس طرح وہ بھی اسلام لائے ۔

یہ ابو الہیثم وہی حضرت علی بن ابی طالبؑ کے بڑے مخلص دوست ہیں جنھیں یاد کر کے آخر عمر میں حضرت زار و قطار روتے تھے جس کا ذکر نہج البلاغہ کے خطب میں موجود ہے ۔

علامہ طبرسی نے اعلام الوریٰ میں احادیث اہل بیتؑ کے ترجمان

مفسرِ قرآن علی بن ابراہیم علیہ الرحمہ کا حوالہ دے کر اِس واقعہ کا پسِ منظر بڑی مکمل تفصیل و تشریح کے ساتھ درج کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اوس وخزرج میں مدت دراز سے ایسی سخت جنگ تھی کہ دن رات میں کسی وقت یہ لوگ جسم سے ہتھیار نہیں اُتارتے تھے، چنانچہ آخری معرکہ ان میں جو ہوا تھا وہ بغاث کا تھا جس میں اوس خزرج کے مقابلہ میں فتح یاب رہے تھے ــــ اسعد بن زرارہ اور ذکوان بن قیس دونوں خزرج میں سے تھے ــــ یہ دونوں ماہ رجب کے عمرہ میں مکّہ گئے تاکہ اہل مکّہ کو اوس کے خلاف اپنا حلیف بنائیں ــــ اسعد بن زرارہ اور عتبہ بن ربیعہ میں پُرانی دوستی تھی۔ اس لئے اسعد نے عتبہ ہی کے یہاں قیام کیا اور اپنا مطلب بیان کیا ــــ عتبہ نے کہا ایک تو ہمارا شہر تم سے دُور ہے۔ پھر یہ کہ آج کل ہمیں ایک فکر ایسی ہے جس کی وجہ سے کسی دوسری مہم میں ہم ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ اس پر اسعد نے تفصیل پوچھی تو عتبہ نے جناب رسالت مآبؐ اور اُن کی دعوتِ اسلامی کا حال بیان کیا۔

یہ لوگ یہود کی زبان سے آخری رسول اور اُس کی دعوتِ توحید کا حال تو سُنتے ہوئے تھے ہی ــــ انھوں نے پوچھا کہ وہ اس وقت کہاں ہیں؟ کہا حجرِ اسماعیل میں بیٹھے ہیں، مگر میں کہے دیتا ہوں کہ اُن کے پاس جانا نہیں اور اُن سے کوئی ایک لفظ بھی سُننا نہ، ورنہ وہ جادوگر ہے۔ اپنے کلام سے تم پر سحر کر دے گا۔ اسعد نے کہا میں

عمرہ کا احرام باندھے ہوئے ہوں۔ مجھے طواف کے لیئے اُدھر جانا تو ضروری ہے۔ عتبہ نے کہا، خیر جاؤ مگر اپنے کانوں میں روئی دے لو کہ اُس کی باتیں تمھارے کان میں نہ پڑیں۔

یہ اہلِ باطل کی کوشش کہ لوگ داعیِ حق کی تقریر سُننے نہ پائیں، بے لوث طالبانِ حق کے لیئے مزید جذب کا باعث بن جایا کرتی ہے۔ اُس وقت تو اسعد نے اپنے میزبان کے کہنے سے اس پر عمل کر لیا اور کانوں میں روئی رکھ لی، مگر اثنائے طواف میں خیال آیا کہ مجھ سے بڑھ کر بھی کوئی جاہل ہو سکتا ہے کہ میں مکّہ سے اپنے شہر واپس جاؤں اور اتنا اہم واقعہ جو مکّہ میں رونما ہے اُس کے متعلق براہ راست کچھ معلومات حاصل کر کے نہ جاؤں کہ اپنے شہر والوں سے جا کر بیان کروں ــــ یہ انتہائی حماقت ہی قرار پا سکتی ہے؟ ــــ یہ خیال آتے ہی روئی کان سے نکال کر پھینک دی اور رسولِ خداؐ کے پاس آ کر عرب کے طریقہ کے مطابق سلام کیا انعم صباحا ''صبح بخیر''۔ حضرتؐ نے سر اُٹھایا اور فرمایا اللہ نے ہم کو اس سے بہتر سلام کا طریقہ عنایت کر دیا ہے جو اہلِ بہشت کا سلام ہے ــــ سلامٌ علیکم۔

اسعد نے کہا اور کیا چیزیں ہیں جن کی طرف آپ دعوت دیتے ہیں۔ فرمایا:ــــ

الیٰ شہادۃ ان لا الٰہ الا اللہ اس کی گواہی کہ سوا اللہ کے کوئی خدا۔

وانی رسول اللہ وادعوکم الی ان لا تشرکوا بہ شیئا و بالوالدین احسانا ولا تقتلوا اولادکم من املاق نحن نرزقکم وایاھم ولا تقربوا الفواحش ما ظھر منھا وما بطن ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق ذلکم وصاکم بہ لعلکم تعقلون و لا تقربوا مال الیتیم الا بالتی ھی احسن حتی یبلغ اشدہ و اوفوا الکیل والمیزان بالقسط لا تکلف نفس الا وسعھا واذا قلتم فاعدلوا ولو کان ذا قربی

نہیں ہے اور یہ کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں اور میں اس کی دعوت دیتا ہوں کہ کسی چیز کو اللہ کے ساتھ شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور فقر و فاقہ کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو (پروردگار کا ارشاد ہے کہ) ہم تمھیں اور انھیں رزق پہونچانے والے ہیں اور فحش کاموں کے پاس نہ پھٹکو چاہے وہ کھلّم کھلّا ہوں اور چاہے خفیہ اور کسی بے گناہ کو ناحق قتل نہ کرو۔ یہ تمھیں اللہ کی ہدایتیں ہیں کہ شاید تم عقل سے کام لو اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر ایسی صورت سے جو اُس کے حق میں بہتر سے بہتر ہو یہاں تک کہ وہ بلوغ کی حد تک پہونچے اور ناپ تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو کسی پر اُس کی قدرت سے زیادہ پابندی عائد نہیں ہوتی اور جب بات کہو تو انصاف کے ساتھ کہو چاہے کسی رشتہ دار کا معاملہ ہو اور اللہ کے

وبعهد الله اوفوا ذٰلكم وصّاكم به لعلّكم تذكّرون۔

عہد کو پورا کرو۔ یہ سب ہدایتیں ہیں تمھارے لیے۔ شاید تم اثر قبول کرو۔

آپ کی تقریر آگے بڑھ رہی تھی اور سُننے والے کے دل و دماغ کے ایک ایک گوشے میں روشنی پیدا ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ اِدھر آپ نے سلسلۂ تقریر ختم کیا اور اُدھر بلا توقف وہ کہنے لگا۔ اشهد ان لا اله الا الله وانك رسول اللهؐ میں گواہی دیتا ہوں کہ بے شک اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں اور آپ اللہ کے پیغمبرؐ ہیں"

اسعد نے کہا یا رسولؐ اللہ میں یثرب کے قبیلۂ خزرج سے ہوں اور ہمارے درمیان اور ہمارے قبیلۂ اوس والے بھائیوں کے درمیان تعلقات برادری منقطع ہیں — اگر آپ کی وجہ سے یہ تعلقات استوار ہو جائیں تو پھر آپ سے بڑھ کر ہمارے نزدیک کوئی نہیں ہو سکتا — یا رسول اللہ ہم یہودیوں سے آپ کے آنے کی خبر سُنتے رہے ہیں اور وہ ہمیں بتا چکے کہ آپ ظاہر ہوں گے اور ایک وقت میں آپ مدینہ تشریف لائیں گے اور اُسے اپنا وطن قرار دیں گے۔ خدا کا شُکر ہے کہ اُس نے مجھے آپ تک پہونچا دیا اور میں تو قبیلۂ اوس کے خلاف روٴسائے قریش کو حلیف بنانے کے لیے آیا تھا۔ اب اگر آپ کی وجہ سے

جنگ ہی ختم ہو جائے تو اس سے بڑھ کر کیا ہے۔

اس گفتگو کے بعد اسعد رخصت ہوئے اور انھوں نے جا کر اپنے دوسرے ساتھی ذکوان کو بتلایا کہ یہ وہ آخری رسول ہیں جن کی علمائے یہود ہمیں اطلاع دیا کرتے تھے اور ان کے اوصاف بیان کرتے تھے چلو ہم بھی اسلام قبول کرو چنانچہ ذکوان نے بھی آکر اسلام قبول کیا اور پھر ان دونوں نے جا کر یثرب میں اسلام کی تبلیغ کی جس کے قبول کرنے کی بہت سے نیک نفوس نے سعادت حاصل کی (اعلام الوریٰ) لیکن اکثر مؤرخین اس پہلی جماعت کو جس کے ذریعہ سے مدینہ میں اسلام پہونچا چھ افراد پر مشتمل بتاتے ہیں۔

عقبۂ اولیٰ

اور

اسلام کے پہلے مبلّغ و معلّم کا تقرّر

ابن سعد کا بیان ہے کہ دوسرے سال پھر موسم حج میں یثرب سے بارہ۱۲ آدمی مکہ معظمہ گئے اور انھوں نے جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جا کر اسلام اختیار کیا اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ پھر یہ لوگ مدینہ واپس ہوئے اور اب اسلام مدینہ میں ہر طرف پھیل گیا ۔۔۔ ابھی تک اسعد بن زرارہ مسلمانوں کو نماز جماعت میں پڑھاتے تھے۔ اس کے بعد اوس و خزرج نے مل کر حضرتؐ کی خدمت

عریضہ لکھا کہ ہماری طرف ایک حافظ قرآن کو بھیج دیجئے جو ہمیں قرآن حفظ کرائے۔ چنانچہ آپ نے اُن کی درخواست پر مصعب بن عمیرؓ کو روانہ فرمایا۔ یہ اسعد بن زرارہ کے مکان پر فروکش ہوئے، اُنھیں قرآن کی تعلیم دینے لگے اور نماز جماعت پڑھانے لگے۔

(طبقات ابن سعد جلد اول صفحہ ۱۴۸)

مگر علامہ طبرسی کی روایت یہ ہے کہ اسعد اور ذکوان پہلے ہی دو آدمی جو شروع شروع رسولؐ کی ملاقات سے شرفیاب ہوئے تھے انھوں نے ہی رسولؐ سے عرض کیا تھا کہ ہمارے ساتھ ایک آدمی بھیج دیجئے جو ہمیں قرآن کی تعلیم دے اور اسلام کی تبلیغ کرے۔ حضرتؐ نے مصعب بن عمیر کو بُلایا۔

مصعب ایک کم عمر نوجوان تھے جنھوں نے اپنے دولت مند ماں باپ کے یہاں بڑے ناز و نعمت سے پرورش پائی تھی اور اپنے تمام بھائی بہنوں میں سب سے زیادہ اپنے والدین کے چہیتے تھے اور کبھی مکہ سے باہر قدم نہ نکالا تھا مگر انھوں نے اسلام قبول کر لیا تو ماں باپ نے سختی کی اور جب اس کا اثر نہ ہوا تو اُنھوں نے گھر سے نکال دیا۔ اب یہ رسولؐ کے پاس آ گئے۔ چنانچہ شعب ابی طالب کے محاصرہ کی سختیاں بھی انھوں نے آپ کے ساتھ جھیلیں۔ اس دوران میں جتنا قرآن نازل ہوا تھا وہ تقریباً سب رسولؐ کے ساتھ رہ کر انھوں نے حفظ کر لیا تھا۔ اور مسائل شرعیہ سے واقف ہو گئے تھے۔ پیغمبرؐ نے اُنھیں حکم دیا کہ وہ

اسعد اور ذکوان کے ساتھ جائیں۔ یہ ان کے ساتھ مدینہ پہونچے اور اسعد کے یہاں قیام کیا۔ ہر روز یہ قبیلہ خزرج کے مجمعوں میں جاتے تھے اور اسلام کی طرف دعوت دیتے تھے اور زیادہ تر نوجوان ان کی تبلیغ سے متاثر ہوتے اور اسلامی پیغام کو قبول کرنے پر آمادہ ہوتے تھے۔

(اعلام الوریٰ)

ان بارہ آدمیوں نے پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جس مقام پر آکر ملاقات کی تھی وہ عقبہ یعنی پہاڑ کی ایک گھاٹی تھی یا اُس مقام کا نام ہی عقبہ تھا اس لیے یہ واقعہ بیعت عقبہ اولیٰ کے نام سے مشہور ہے۔

مدینہ میں اسلام کی کامیابی
اور
سعد بن معاذ کا قبولِ اسلام

عصبیت اور عناد کی اس بدنصیبی کو کیا کہیے کہ علمائے جمہور نے مشترک اسلامی واقعات اور حالات صحابہ کرام میں بھی اُن اجزاء کو جزوِ تاریخ نہیں بنایا جو اہل بیت رسولؐ کے ذریعہ سے بیان ہوئے ہیں مگر غنیمت ہے کہ اس خزانے کے دستبرد زمانہ سے تاراج ہوتے رہنے کے باوجود بھی کچھ جواہر ریزے ابھی تک ہمارے پاس محفوظ ہیں چنانچہ مذکورۂ بالا عنوان کے ماتحت ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں علامہ طبرسی نے

محفوظ کردہ ذخیرہ کا اقتباس ہے جو بطریق اہل بیت علیہم السلام پہونچا ہے اور جس سے عام تاریخوں کا دامن خالی ہے۔

علامۂ موصوف رقم طراز ہیں کہ :۔

عبداللہ بن اُبی قبیلۂ خزرج کا رئیس تھا اور چونکہ جنگ بغاث میں اس نے قبیلۂ اوس کے مقابلہ میں اپنے قبیلہ والوں کا ساتھ نہیں دیا تھا یہ کہکر کہ تم ناحق پر ہو اور اوس والے مظلوم ہیں۔ میں اس ظلم میں تمھارے ساتھ شریک نہیں ہوں گا۔ اس بے لوث کردار اور غیر جانبداری کا اثر یہ تھا کہ جب خزرج والوں کو شکست ہوئی اور اوس غالب ہوئے تو اوس اور خزرج سب نے متفق ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ ہم عبداللہ بن ابی کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیں اور اس مقصد سے ایک تاج بنوایا گیا جس کے درمیان میں جڑنے کے لیے بس ایک شایانِ شان گوہر آبدار کی تلاش تھی جس کی فکر کی جا رہی تھی۔ اسی درمیان میں اسعد بن زرارہ اور ذکوان بن قیس اپنے ساتھ مصعب بن عمیر کو لے کر آئے اور اسلام کا پیغام پہونچایا جس کے نتیجہ میں عبداللہ بن ابی کی بادشاہت کا منصوبہ درہم و برہم ہو گیا۔ اس لیے عبداللہ بن ابی نے اسعد کی اس تحریک کو ناپسند کیا اور ان کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے لگا۔ اسعد کے لیے عبداللہ بن ابی کی شخصیت کا اثر زرا پریشان کن محسوس ہوتا تھا اس لیے انھیں فکر تھی کہ کوئی با اثر شخصیت ہمارے ساتھ بھی ہو جائے جو وجاہت میں عبداللہ بن ابی کی ہم مقابل یا اس سے طاقتور ثابت ہو۔ آخر وہ سوچے

اور اُنھوں نے مصعب بن عمیر سے کہا کہ میرے ماموں سعد بن معاذ قبیلۂ اَوس کے رؤساء میں سے ہیں اور بڑے سنجیدہ، صاحب کردار آدمی اور تمام بنی عمرو بن عوف کا مرکز اطاعت ہیں۔ اگر وہ اس تحریک میں شامل ہو جائیں تو پھر ہماری بڑی کامیابی ہے لہذا چلیے اُن کے محلہ میں چلیں۔ ممکن ہے اللہ ہمیں کامیاب کر دے چنانچہ مصعب اسعد بن زرارہ کے ساتھ سعد بن معاذ کے محلہ میں آئے اور ایک کنوئیں کی جگہ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

بچوں اور نوجوانوں نے جو اسعد کے ساتھ ایک نئے آدمی کو دیکھا تو آکر چاروں طرف سے گھیر کر کھڑے ہو گئے اور جناب مصعبؓ نے قرآن مجید کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سُنانا شروع کر دیں۔ یہ خبر سعد بن معاذ کو پہنچی۔ وہ پریشان ہو گئے اور انھوں نے اسید بن حضین سے جو اشراف قبیلہ میں سے تھے اور اس وقت اُن کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہا کہ یہ تو بڑی خرابی کی بات ہے کہ ابو امامہ اسعد بن زرارہ اس قریشی جوان کو لے کر ہمارے محلہ میں آگئے ہیں اور وہ ہمارے نوجوانوں کو بیٹھا ہوا بہکا رہا ہے۔ کہیں ان پر کوئی خراب اثر نہ پڑ جائے۔ تم جاؤ اور انھیں منع کر دو کہ وہ اس محلہ میں نہ بیٹھیں۔ اسید بن حضین اس مقصد سے چلے۔ اسعد نے اُنھیں آتا ہوا دیکھا تو جناب مصعبؓ سے کہا کہ یہ ایک معزز آدمی ہے جو آ رہا ہے۔ یہ اگر ہمارے پیغام کو قبول کر لے تو بھی کوئی کم کامیابی نہیں ہے۔ جب اسید قریب آئے تو انھوں نے اسعد سے کہا

کہ اے ابوامامہ تمھارے ماموں نے مجھے بھیجا ہے کہ تم ہمارے مجمع میں نہ ٹھہرو، اور ہمارے نوجوانوں کو خراب نہ کرو، ورنہ ڈر ہے کہ کہیں قبیلہ، اوس کے آدمیوں سے تمھیں کچھ نقصان نہ پہونچ جائے۔ جناب مصعب نے کہا کہ آپ زرا دیر ہمارے پاس بیٹھ جائیے، اور ہم جو چیز پیش کرتے ہیں وہ سُن لیجیئے۔ پھر آپ کو اختیار ہے۔ اگر آپ اُسے پسند نہ کریں گے تو ہم بلاتکلف رخصت ہو جائیں گے۔ یہ سُن کر اسید بیٹھ گئے اور جناب مصعب نے قرآن کے ایک سورہ کی تلاوت کی، جسے سنتے ہی اسید متاثر ہو گئے۔ کہا جب کوئی آپ کے حلقہ میں داخل ہوتا ہے تو اُسے کیا کرنا پڑتا ہے؟ مصعب نے کہا کہ بس غسل کرتے ہیں، پاک کپڑے پہنتے ہیں، شہادتیں زبان پر جاری کرتے ہیں، اور دو رکعت نماز پڑھ لیتے ہیں۔ یہ سُننا تھا کہ اسید بے تحاشا کپڑوں سمیت اُسی کنوئیں میں کود پڑے۔ پھر نکل کر اپنے کپڑے نچوڑے اور کہا اب مجھے شہادتین کی تعلیم دیجیئے۔ جب مصعب نے کلمہ کی تلقین کی۔ انھوں نے کلمہ پڑھا اور دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر اسعد نے کہا کہ اب میں تمھارے ماموں صاحب کے پاس جاتا ہوں، اور کوشش کرتا ہوں کہ وہ خود یہاں تک آجائیں۔ اسید کافی دیر کے بعد واپس ہوے تھے۔ اس لیے وہاں اُن کا انتظار ہو ہی رہا تھا۔ سعد بن معاذ نے انھیں دور ہی سے دیکھ کر دوسرے حاضرین سے کہا کہ خدا کی قسم اسید بدلے ہوے آرہے ہیں۔ چنانچہ اسید آئے تو اس کی تصدیق ہو گئی۔

اور اب خود سعد بن معاذ اُس مقام پر آ گئے ۔ جناب مصعب نے حمٓ تنزیل الکتٰب من الرحمٰن الرحیم شروع کر کے سُنانے کا آغاز کیا۔ خود مصعب کا بیان ہے :-

واللہ لقد رأینا الاسلام فی وجہہ من قبل ان یتکلم۔	بخدا کوئی بات کرنے سے پہلے اسلام کا جلوہ سعد کے چہرے میں نظر آنے لگا۔

وہ اسید سے سن ہی چکے تھے کہ کیا کیا کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے انھوں نے بغیر کوئی حرف بھی زبان سے کہے ہوئے اپنے ساتھ کے آدمی سے کہا کہ ہمارے گھر سے جا کر صاف کپڑے لے آؤ۔

پھر اُنھوں نے غسل کیا، کلمہ شہادتین زبان پر جاری کیا اور دو رکعت نماز پڑھی۔ اس کے بعد مصعب کا ہاتھ پکڑا اور کہا اب آپ میرے ساتھ چلیے، اور بس اب بے تکلف اپنے پیغام کی اشاعت کیجیے، اور کسی سے اندیشہ نہ کیجیے۔ اس کے بعد سعد بن معاذ بنی عمرو بن عوف کے مجمع میں آ گئے اور کہا سب مرد عورت، چھوٹے بڑے میرے پاس آ کر جمع ہوں۔ جب سب آ گئے تو اُنھوں نے پوچھا بتاؤ! میری تم کیا حیثیت سمجھتے ہو؟ سب نے کہا آپ ہمارے واجب الاطاعت سردار ہیں۔ آپ جو حکم دیں ہم اس کی تعمیل کے لیے حاضر ہیں۔ انھوں نے کہا اچھا تو پھر تم میں سے کسی مرد اور عورت کو کوئی لفظ بھی زبان سے نکالنا حرام ہے، جب تک وہ اس کلمہ شہادتین کا اقرار نہ کر لے۔ ہم

سب کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمیں اس عزت سے سرفراز کیا، اور اس کی تو ہمیں علمائے یہود برابر خبر دیا کرتے تھے، چنانچہ پورے قبیلہ کے آدمی جو اس وقت موجود تھے، سب نے اسلام قبول کیا، اور کوئی گھر ایسا نہ رہا جس میں کوئی ایک مسلمان مرد یا عورت موجود نہ ہو۔

اور اب اوس اور خزرج دونوں قبیلوں میں کے جتنے ممتاز آدمی تھے سب نے اسلام قبول کر لیا، اس لیے کہ وہ اس کی اطلاع علمائے یہود کی زبان سے برابر سنتے رہے تھے۔ (اعلام الوری)

بیعت عقبۂ ثانیہ
اور
قرار داد ہجرت

اب ان نو مسلموں کو جنھوں نے غائبانہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم پر ایمان اختیار کیا تھا، خود آپ کی خدمت میں پہونچنے اور آپ کی زبان سے آپ کے ارشادات کو سننے کا بڑا اشتیاق تھا، اور منتظر تھے کہ پھر موسم حج آئے تو مکہ جائیں۔

اب جو موسم حج قریب آیا تو آپس میں وعدے وعید ہونے لگے کہ ہم بھی چلیں گے۔ ہم بھی چلیں گے، چنانچہ وقت آنے پر کم و بیش ستر آدمی اوس و خزرج میں سے مکہ معظمہ آئے اور رسالتمآبؐ کی خدمت میں آ کر تسلیمات بجا لائے، اور غالبًا مدینہ کی طرف تشریف آوری کی

درخواست بھی پیش کر دی۔ آپ نے اُن سے فرمایا کہ حج سے فراغت کے بعد وسط ایام تشریق، نَفرِ اوّل والے دن (۱۲ر ذی الحج) مقام عقبہ کے نیچے کے حصّہ میں، رات کو جب سناٹا ہو جائے، تو خاموشی کے ساتھ میرے پاس آ کے جمع ہونا، تو تفصیل سے گفتگو ہوگی۔ چنانچہ وقت آنے پر حضرتؐ، جناب عباس بن عبدالمطلب کے ساتھ وہاں پہلے پہونچ گئے اور پھر یہ لوگ ایک ایک کر کے آپ کے پاس پہونچتے گئے، جن میں سب سے پہلے حضرت کے پاس آنے والے رافع بن مالک زرقی تھے، اور اس کے بعد رفتہ رفتہ ستّر آدمی سب جمع ہو گئے۔ جناب عباس بن عبدالمطلب نے جو غالباً اسی غرض سے رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آرہے تھے، بڑے پُر وقار بزرگانہ انداز میں ایک تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ:-

> "تم نے محمدؐ کو جو دعوت دی ہے اُس کا حال معلوم ہوا۔ تمھیں یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہیے کہ محمدؐ کوئی بے گھر بے در انسان کی حیثیت سے کسی ٹھکانے کے محتاج ہیں۔ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ وہ اپنے گھرانے کے چشم و چراغ اور اپنے قبیلہ کی نہایت ہر دلعزیز شخصیت ہیں، اور ہم میں سے ہر شخص اُن کے پسینے پر خون بہلنے کے لیے تیار رہا ہے، جیسے ہم ایک دو دن نہیں تیرہ برس سے استقلال کے ساتھ نباہ رہے ہیں، مگر اپنے مقصد کی خاطر خود اُن کا رجحان ہے کہ وہ تم لوگوں کی دعوت کو

قبول کرلیں، تو میں تم سے یہ بات معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم میں اگر اتنی طاقت، فن حرب و ضرب سے واقفیت، زحمات و مصائب کے برداشت کی قوت، اور یہ سمجھتے ہوئے کہ شاید عرب کے قبائل ایک دم سب تمہارے خلاف صف آرا ہو جائیں، پھر بھی اتنی ہمت ہو کہ تم ثابت قدمی اور استقلال کے ساتھ اپنی بات پر قائم رہو گے، تو ابھی آپس میں خوب رائے مشورہ کر لو، سوچ سمجھ لو۔ سب پہلوؤں پر غور کر لو، اور پھر سچائی کے ساتھ از سر نو وفاداری کا عہد کرو، اور بسم اللہ ان کو لے جاؤ اور اگر ذرا بھی کمزوری کا اندیشہ ہو، تو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم تیرہ۱۳ برس سے جس طرح بن رہا ہے ان کی حفاظت کر رہے ہیں۔ اب بھی جب تک دم میں دم ہے ان کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے، اور یہیں خدا ان کو کامیاب و کامران کرے گا۔"

(طبقات ابن سعد ج ۱ صـ ۱۴۹)

علامۂ طبرسی کی روایت ہے کہ حضرتؐ نے عقبہ کے مقام پر تفصیلی گفتگو کو مناسب نہ سمجھتے ہوئے اُنھیں وہاں سے خانۂ عبدالمطلب میں جا کر جمع ہونے کا حکم دیا، اور پوری بات چیت وہاں ہوئی۔ اس موقع پر جناب رسالت مآب صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ جناب عباس جناب حمزہ اور حضرت علیؑ بھی موجود تھے، اور اہل مدینہ جو آئے تھے اُن میں کچھ وہ تھے جو اسلام قبول کر چکے تھے، اور بہت سے ابھی وہ

تھے جو دائرۂ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے، چنانچہ عبداللہ بن اُبی بھی اس جماعت کے ساتھ موجود تھا۔ (اعلام الوریٰ)

جناب عباسؓ کی تقریر اپنی سنجیدگی کے ساتھ پورے مجمع پر چھا گئی تھی۔ اس کے ختم کے بعد بس تھوڑی دیر سکوت رہا اور پھر اہل مدینہ میں سے براء بن معرور کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے:۔

"جو کچھ آپ نے فرمایا وہ ہم نے سُنا، مگر ہم آپ کو اطمینان دلاتے ہیں کہ اگر ہمارے دلوں میں ذرا بھی دغدغہ ہوتا تو ہم یہ پیشکش کرتے ہی نہ۔ ہم نے خوب سوچ سمجھ لیا ہے، اور طے کر لیا ہے کہ سچائی اور وفاداری میں ذرہ بھر کمی نہ کریں گے، اور پیغمبر خداؐ کی نصرت میں اپنی جانیں دینے میں دریغ نہ کریں گے۔"

یہ سُن کر حضرت پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ آیات قرآنی کی تلاوت فرمائی اور بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا، جس پر سب سے پہلے براء بن معرور اور بقولے ابو الہیثم بن تیہان یا اسعد بن زرارہ نے بیعت کی، اور پھر ستر آدمیوں نے سب نے بیعت کی، اور جو اُن میں سے مسلمان نہ تھے انھوں نے اسی وقت اسلام قبول کیا۔

(طبقات ابن سعد، ج ۱، صہ ۱۴۹)

علامۂ طبرسی کی روایت ہے کہ حضرت رسول خداؐ نے اُن سے فرمایا کہ تم لوگ اپنے میں سے بارہ "نقیبوں (ذمہ دار نمائندوں) کو منتخب کرکے ان کے نام بتاؤ، جو تمھاری طرف سے جواب دہی کے ذمہ دار ہوں،

چنانچہ نوؔ آدمی خزرج میں سے، اور تینؔ اوس میں سے اُسی وقت مقرر ہو گئے۔ خزرج کے نوؔ آدمی یہ تھے :-

(۱) اسعد بن زرارہ (۲) برار بن معرور (۳) عبداللہ بن حزام (جناب جابر بن عبداللہ کے والد) (۴) رافع بن مالک (۵) سعد بن عبادہ (۶) منذر بن عمرو (۷) عبداللہ بن رواحہ (۸) سعد بن ربیع (۹) عبادہ بن صامت۔

اور اوس میں سے (۱) ابو الہیثم بن تیہان (۲) اسید بن حضیر (۳) سعد بن خثیمہ۔

اس سب کے بعد ان لوگوں نے کہا "یا رسول اللہؐ! پھر اب بس تشریف لے چلیے۔ حضرتؐ نے فرمایا ابھی حکم الٰہی کا انتظار ہے۔ (اعلام الوریٰ)

اصحاب کی روانگی

جان بچانے کے لیے گھبراہٹ میں مرکز کو چھوڑنا فرار ہوتا ہے اور فرار کرنے والا یہ نہیں سوچتا کہ دوسروں پر کیا گزرے گی، مگر مقصد کی خاطر کسی مناسب مرکز کی تلاش کر کے اپنی جگہ سے حرکت کرنا ہجرت ہے۔ ہجرت کرنے والا پورے انتظام کے ساتھ روانہ ہوتا ہے۔ اُس کے سامنے فقط اپنی جان کا مسئلہ نہیں ہوتا، بلکہ پوری جماعت کے مفاد کا مسئلہ ہوتا ہے، اور اصولوں کے تحفظ کا منصوبہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر

رسول ؐ کو فقط اپنی جان بچا کر نکلنا ہوتا تو یہ موقع بہت اچھا تھا کہ مدینہ والوں کی اتنی بڑی جماعت موجود تھی، جو پورے تحفظ کے ساتھ اپنی معیت میں آپ کو لے جانا چاہ رہی تھی، مگر آپ نے اُن کی درخواست کو قبول نہیں کیا اور فرما دیا "ابھی حکم الٰہی کا انتظار ہے۔"

یہ "حکم الٰہی" کیا تھا؟ اُن تمام انتظامات کی تکمیل جو جماعت کے تحفظ اور اخلاقی ذمہ داریوں کے پورا کرنے کے لیے ضروری تھا۔

چنانچہ اہل مدینہ تو اس قول قرار کے بعد اپنے شہر کی طرف واپس گئے، اور یہاں مشرکین کو اس کا حال معلوم ہوا کہ اب مدینہ جانے کا منصوبہ بن گیا ہے، تو انھوں نے مسلمانوں پر از سر نو مظالم کے پہاڑ توڑنا شروع کر دیے۔ اس لیے حضرت پیغمبر خداؐ نے اب ان مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ رفتہ رفتہ مدینہ کی طرف روانہ ہوں۔

یہ ہوتا ہے ایک صاحب کردار سردار کا عمل کہ وہ جماعت کو ناخوشگوار ماحول میں بے یار و مددگار چھوڑ کر خود نہیں جاتا، بلکہ پہلے اُن کے تحفظ کا سامان کرتا ہے۔

تاریخ کی تصریح ہے کہ رسول ؐ کے علاوہ دو تین آدمیوں کے سوا، اصحاب میں سے اب مکہ میں کوئی رہ نہیں گیا تھا، یا پھر ایسے بیمار، مقید یا درماندہ افراد رہ گئے تھے، جن کا جانا کسی طرح ممکن ہی نہ تھا۔

(طبقات ابن سعد، ج ۱، ص ۱۵۴)

منصوبۂ قتل

اور

رسولؐ کی ہجرت

عام طور سے ہجرت رسولؐ کا پس منظر یوں سمجھا جاتا ہے کہ مشرکین نے آپ کے قتل کا ارادہ کر لیا، تو آپ نے مکہ معظمہ سے ہجرت فرمائی۔ اس طرح ایسا محسوس ہوتا ہے، کہ یہ ہجرت صرف خوفِ جان سے تھی۔ مگر ہمارے گزشتہ بیانات، اور تاریخ کے تصریحات سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ ہجرت کا منصوبہ پہلے سے قائم تھا، اور اُس کی تکمیل ہو رہی تھی۔ جیسا کہ ہجرت حبشہ میں لکھا جا چکا ہے۔ مشرکین کو اگر ان افراد سے ذاتی عداوت ہوتی، تو وہ اس پر، کہ یہ اُن کے ملک سے چلے جا رہے ہیں، خوش ہوتے، مگر اُنھیں تو اُس مقصد سے دشمنی تھی، جس کی ترقی کے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت میں امکانات بعید محسوس ہو رہے تھے، اور اب مدینہ کی طرف ہجرت میں، امکانات بہت قریب نظر آ رہے تھے، اس لیے وہ اس ہجرت سے نعل در آتش تھے، اور انھوں نے جب دیکھا کہ اصحاب تقریباً سب چلے گئے، اور اب صرف رسولؐ رہ گئے ہیں، اور یہ بھی بس جانے ہی والے ہیں، تو اُنھوں نے اب یہ طے کر لیا کہ وہ آپ کا وہاں پہونچنے سے پہلے ہی خاتمہ کر دیں، اور اس طرح آپ کی

جان لینے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہجرت اندیشۂ قتل کی بنا پر نہیں ہوئی، بلکہ سامانِ قتل ارادۂ ہجرت کی بنا پر پیدا ہوا۔

تاریخ کے الفاظ ملاحظہ ہوں :-

لما رأی المشرکون اصحاب رسول اللہؐ قد حملوا الذراری والاطفال الی الاوس والخزرج عرفوا انها دار منعة وقوم اهل حلقة و بأس فخافوا خروج رسول اللہؐ فاجتمعوا فی دار الندوة ولم یتخلف احد من اهل الرأی والحجی منهم لیتشاوروا فی امرہ۔

(طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۵۳)

جب مشرکین نے دیکھا کہ اصحابِ پیغمبرِ خدا اپنے ساتھ عورتوں، اور بچوں کو بھی اوس و خزرج کی طرف لے گئے ہیں تو وہ سمجھے کہ وہ ان کے لیے قابلِ اطمینان و محفوظ مقام ہے، اور وہ ایک طاقت ور جماعت ہے۔ تو اب انھیں یہ اندیشہ ہوا کہ رسولؐ بھی وہاں پہنچ جائیں گے، لہذا یہ لوگ دارالندوہ میں جمع ہوئے، اور اُن میں کوئی صاحبِ عقل و رائے شخص ایسا نہ تھا جو اس جلسہ میں شریک نہ ہوا ہو تاکہ آپ کے بارے میں وہ باہم رائے مشورہ کریں۔

علامۂ طبری کا بیان ہے کہ دارالندوہ میں اشرافِ قریش میں سے چالیس اشخاص کا مجمع تھا، اور یہاں کے شرکا میں یہ قید

رکھی گئی تھی کہ چالیس برس سے کم عمر کا کوئی آدمی شریک نہ ہو۔ صرف ایک عتبہ بن ربیعہ (امیر شام معاویہ کا نانا) ایسا تھا، جس کی عمر چالیسؔ سے کچھ کم تھی۔ (اعلام الورےٰ)

جب سب جمع ہو گئے تو قتل رسولؐ کے تدابیر پر غور کیا جانے لگا خاص پہلو جو پیش نظر تھا وہ یہ کہ اگر رسولؐ کو شہید کر دیا جائے تو بنی ہاشم خون کا بدلہ ضرور لیں گے۔ اس طرح ایک عرصہ تک انتقام اور انتقام در انتقام کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

ابو جہل نے یہ رائے دی کہ کوئی ایک آدمی اس کا ذمہ دار نہ ہو، بلکہ تمام قبائل قریش میں سے ہر ہر قبیلہ کا ایک آدمی چُنا جائے، اور وہ سب مل کر آپ کو قتل کریں، تاکہ آپ کا خون تمام قبائل میں تقسیم ہو جائے، اور اولاد عبد مناف کی سمجھ میں نہ آئے کہ وہ کس کس سے اس خون کا بدلہ لیں۔ (طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۵۳)

چنانچہ پندرہ آدمی اس کے لیے منتخب کیے گئے، جن میں خود بنی ہاشم میں سے ایک ابو لہب بھی تھا کہ یہ سب لوگ رات کو پیغمبرؐ کے مکان میں داخل ہو کر آپ کو شہید کر ڈالیں۔ (اعلام الوریٰ)

اس صورت حال سے صاف ظاہر ہے کہ مشرکین نے یہ شہید کرنے کا منصوبہ صرف اس لیے بنایا تھا کہ آپ ہجرت نہ کر سکیں، یعنی جو منصوبہ ترقی اسلام کے لیے بنایا گیا ہے وہ پورا نہ ہو سکے۔

اس کے بعد رسولؐ کے لیے صرف اپنی جان کا سوال نہ تھا، بلکہ

۔ اُس بلند مقصد کا سوال تھا جس کے لیے ہجرت کی جارہی تھی، اور اب ضرورت اس کی تھی کہ مشرکین کے تدابیر کے مقابلہ میں خالق کی جانب سے ایسی تدبیر کی جائے کہ مشرکین اپنا سا مُنھ لے کر رہ جائیں، اور آپ اُن کے اندر سے نِکل جائیں۔ یہی اُن کے منصوبہ کے ناکام بنانے، اور اللہ کی جانب سے رسول ؐ کو اُن کے مقصد میں کامیابی کی تدبیر کا ذکر ہے، جسے قرآن مجید نے ان الفاظ کہا ہے کہ :۔

ویمکرون ویمکر اللہ واللہ خیر الماکرین۔ (قرآن مجید)	وہ اپنا منصوبہ بنا رہے تھے، اور اللہ اپنا منصوبہ بنا رہا تھا، اور اللہ سے بڑھ کر کسی کا منصوبہ نہیں ہو سکتا۔

یہ خداوندی منصوبہ کیا تھا؟ اسے اُسی قدیم ترین مورخ ابن سعد کی زبان سے سُنیے :۔

واتی، جبریل رسول اللہؐ فاخبرہ الخبر وامرہ ان لاینام فی مضجعہ تلک اللیلۃ وامر علیّا ان یبیت فی مضجعہ تلک اللیلۃ۔ (طبقات ج ۱ صـ ۱۵۳)	جبریل امینؑ رسولِ خداؐ کے پاس آئے اور آپ کو واقعہ کی اطلاع دی، اور یہ حکم الٰہی پہونچایا کہ آپ آج اپنے بستر پر آرام نہ فرمائیں، اور علی بن ابی طالبؑ آج رات کو آپ کے بستر پر آرام کریں۔

علامہ طبرسیؒ کا بیان ہے کہ پیغمبر خداؐ نے حکم دیا کہ آپ کا بستر بچھا دیا جائے، پھر حضرت علی بن ابی طالبؑ کو بلایا

فقال یا علی افدنی بنفسک قال نعم یا رسول اللہؐ قال نم علی فراشی والتحف ببردتی فنام علی فراش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ والتحف ببردتہ۔

فرمایا اے علی اپنے کو مجھ پر فدا کردو! کہا بسر و چشم۔ فرمایا میرے بستر پر سو رہو اور میری چادر اوڑھ لو، چنانچہ آپ نے رسولؐ کے بستر پر آرام کیا اور آپ کی چادر اوڑھ لی۔

(اعلام الوریٰ)

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں :-

"چوں آنحضرتؐ خواست کہ وقت صباح بہ ہجرت آید علی مرتضیٰؑ را فرمود کہ شب در محل خواب گاہ آں سرور بہ خواب رود تا مشرکاں در مقام التباس آمدہ از حقیقت حال آگاہ نہ شوند" (مدارج النبوۃ)

یعنی حضرت علیؑ کو بستر پر اس لیے لٹایا گیا کہ مشرکین دھوکے میں رہیں اور انھیں پتہ نہ چلے کہ رسولؐ تشریف لے گئے ہیں۔

اب یہ کہ آپ کو مکہ معظمہ میں کس لیے چھوڑا گیا تھا؟ اس کا جواب بھی محدث مذکور نے تحریر کیا ہے :-

"اصل باعث بر گزاشتن علی مرتضیٰؑ رد ودائع کفار قریش

بود کہ بہ اعتقاد دیانت و مشاہدۂ امانت نزد آنحضرتؐ
می گزاشتند و آنحضرتؐ را محمد امین صادق می گفتند۔"

(مدارج النبوۃ)

یعنی اصل وجہ حضرت علیؓ کو مکہ میں چھوڑنے کی یہ تھی کہ مشرکین کی امانتیں جو وہ رسول خداؐ کے پاس آپ کی ایمان داری کے یقین اور امانت داری کے مشاہدہ کی وجہ سے رکھا کرتے تھے، اور جس کی وجہ سے وہ آپ کو صادق اور امین کہا کرتے تھے اُن کے مالکوں کو واپس کر دیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ باوجودیکہ مشرکین رسولؐ کے دشمن جان تھے، پھر بھی آپ کی امانت داری پر اتنا اعتماد رکھتے تھے کہ اُن کی امانتیں شب ہجرت تک آپ کے پاس موجود تھیں، اور یہ اُن کی امانتوں کا احترام اور اس اخلاقی ذمہ داری کی تکمیل تھی جس کے لیے آپ نے یہ قربانی گوارا فرمائی تھی کہ اپنی گود کے پالے ہوئے عزیز ترین شخص کو اس خطرناک ماحول کے اندر گھر میں چھوڑ دیا تھا، اور پھر یہ مقصد کے تحفظ کی خاطر اُس سے بڑی قربانی تھی کہ اُنھیں اپنے بستر پہ کھنچی ہوی تلواروں کے حصار میں چھوڑ گئے تھے۔ مؤرخ ابن سعد کے الفاظ ہیں:۔

فبات فیہ علیؑ و تغشّی	علیؓ بستر رسول پر سوئے اور
بردا احمر حضرمیًا	وہ سرخ رنگ کی حضرمی (حضرموت کی

کان رسول اللہ صلعم ینام فیہ۔ (طبقات ج ۱ ص ۱۵۳)

بنی ہوئی) چادر اوڑھ لی جس میں رسول آرام فرمایا کرتے تھے۔

اسلام کی خاطر یہ حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی فداکاری بالکل متفق علیہ حیثیت رکھتی ہے۔ محدث عبدالحق دہلویؒ لکھتے ہیں: ۔

پس خواب کرد علی مرتضیٰؑ در جائے خواب آنحضرتؐ پوشید خود را ببرد خاص آنحضرتؐ کہ آں را پوشیدہ بخواب رفتی پس او رضی اللہ عنہ نخستین کسے است کہ فروخت و فدا کرد نفس خود را در راہ محبت رسولِ خداؐ و گویند کہ کریمۂ و من الناس من یشری نفسہ ابتغآء مرضات اللہ واللہ رؤف بالعباد و دریں باب شعرے از وے رضی اللہ عنہ نقل می کنند کہ می فرمود: ۔

وقیت بنفسی خیر من وطئ الثریٰ

ومن طاف بالبیت العتیق بالحجر

علی بن ابی طالبؑ حضرتؐ کے بستر پہ سوئے ہیں اور حضرتؐ کی چادر خاص جسے اوڑھ کر حضرتؐ آرام فرماتے تھے اوڑھ لی۔ اس طرح آپ پہلے وہ شخص ہیں، جس نے اپنی جان کو بیچ ڈالا اور فدا کر دیا رسول خداؐ کی محبت کی راہ میں اور کہا جاتا ہے کہ قرآن کی یہ آیت کہ "انسانوں میں وہ بھی ہے جس نے اپنی جان رضائے خدا کی خاطر بیچ ڈالی ہے اور اللہ بندوں پر مہربان ہے" اسی کے بارے میں اُتری ہے اور اس بارے میں خود حضرت علیؑ کی زبانی کچھ اشعار بھی وارد ہوئے ہیں کہ آپ فرماتے تھے: ۔

میں نے اپنے کو سپر بنا دیا اُس کی جو زمین پر چلنے والوں اور خانۂ کعبہ کا طواف کرنے والوں میں بہترین ذات ہے۔

وخاف رسول اللہ ان یمکروا بہ
فنجّاہ ذو الطول الالہ من المکر

و در مواہب این دو بیت ذکر کردہ و در روضۃ الاحباب دو بیت دیگر نیز آوردہ کہ :-

وبات رسول اللہ فی الغار آمنا
موقّی وفی حفظ الالہ وفی ستر
وبتّ اراعیہم وما یثبتوننی
وقد وطنت نفسی علی القتل والاسر

(مدارج النبوۃ)

رسولؐ کو اندیشہ پیدا ہوا کہ مشرکین نے جو منصوبہ آپ کے خلاف بنا لیا ہے وہ پورا نہ ہو جائے تو اللہ نے اُن کو مشرکین کے پھندے سے چھٹکارا دیا۔

مواہب لدنیہ میں یہی دو شعر ذکر کیے ہیں اور روضۃ الاحباب میں دو شعر اور بیان ہوئے ہیں کہ :-

شب گزاری رسول خداؐ نے غار میں جا کر امن و سکون سے محفوظ طور پر خدا کے حفظ و امان میں۔

اور میں نے پوری رات اس طرح گزاری کہ دشمنوں کی نقل و حرکت کو دیکھ رہا تھا اور وہ مجھے پہچان نہیں رہے تھے اور میں بالکل قتل یا قید ہونے کے لیے تیار تھا۔

مسٹر کے۔ اے حمید بی۔ اے (لندن) بیرسٹر ایٹ لا، لاہور نے لکھا ہے کہ :-

"آپ نے حضرت علیؑ کو اپنے بستر پر سلایا اور خود ۱۲ ستمبر ۶۲۲ء کو روانہ ہو گئے۔"

(تاریخ مسلمانان عالم حصہ اول ص۹۶)

رات بھر وہ لوگ رسولؐ کے مکان کو گھیرے رہے اور شقوق در سے دیکھتے تھے کہ رسولؐ لیٹے ہوئے ہیں اور آپس میں طے کر رہے تھے کہ کون آگے بڑھ کر اس سونے والے کی زندگی کا خاتمہ کرے گا۔

(طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۵۳)

وہ سب تو اس پر تلے ہوئے تھے کہ رات ہی کو مکان کے

اندر گھس جائیں، مگر ابولہب نے کہا کہ نہیں۔ رات بھر ہم نگرانی کریں اور جب صبح ہو تو اندر جائیں۔ اس کے کہنے سے وہ شب بھر محاصرہ کیے ہوئے کھڑے رہے۔ (اعلام الوریٰ)

رسولؐ تو خدا کی قدرت سے اُن کے گھیرے میں سے نکل کر آغاز شب ہی میں چلے گئے تھے۔ جب صبح ہوئی تو

قام علیؑ من الفراش فسألوہ عن رسول اللہ صلعم فقال لا علم لی بہ۔ (طبقات ابن سعد)

علیؑ بستر سے اُٹھ کر کھڑے ہوئے۔ اُن سب نے رسول خداؐ کو پوچھا کہ وہ کہاں ہیں؟ آپ نے کہا مجھے اُن کے متعلق خبر نہیں ہے۔

علامہ طبرسی لکھتے ہیں:۔

فلمّا اصبحت قریش و اضاء الصبح وثبوا فی الحجرۃ وقصدوا الفراش فوثب علیؑ الیہم وقام فی وجوھھم فقال لھم ما لکم قالوا این ابن عمک قال علیؑ جعلتمونی علیہ رقیبا۔ (اعلام الوریٰ)

جب صبح ہوئی اور روز روشن ہوا تو وہ سب چھلانگیں مار مار کر مکان کے اندر داخل ہو گئے اور بستر کے پاس پہونچ گئے۔ اب علیؑ جست کر کے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُن کے سامنے کھڑے ہو گئے اور کہا کیوں تمھارا کیا مطلب ہے؟ انھوں نے کہا تمھارے چچا زاد بھائی کہاں ہیں؟ آپ نے کہا کیا تم نے مجھے اُن کا نگراں مقرر کیا تھا؟

یہ سن کر وہ لوگ پیغمبر خداؐ کی تلاش کے لیے چلے۔

اب اُدھر کی سُنیے۔ رسول خداؐ حضرت علی بن ابی طالبؑ کو بستر پر لٹا کر خاموشی کے ساتھ مشرکین کے حلقے سے نکل گئے اور تیزی کے ساتھ روانہ ہوئے کہ جلد مکہ کے حدود سے باہر نکل جائیں اور قبل اس کے کہ مشرکین کو آپ کی روانگی کی اطلاع ہو آپ اُس جگہ پہونچ جائیں جو خالق کی طرف سے آپ کی حفاظت کے لیے جائے پناہ قرار دی گئی ہے، مگر اتفاق کی بات کہ اُس وقت حضرت ابو بکر کسی ضرورت سے مکان کے باہر آئے تھے۔ انھوں نے رسولؐ کو جاتے ہوئے دیکھا تو تیزی سے قدم بڑھا کر آپ سے آکر ملحق ہو گئے، اور پوچھا کہاں جا رہے ہیں؟ یہ بہت نازک موقع تھا۔ رسولؐ کی نقل و حرکت پر کسی کا اُس وقت مطلع ہو جانا افشائے راز کے خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لیے پیغمبر خداؐ نے اپنی حکمت کاملہ سے محفوظ صورت یہی سمجھی کہ ان کا ہاتھ پکڑ لیا، اور کہا چلو بس تم بھی میرے ساتھ ہی چلو۔ اس طرح آپ پیغمبر خداؐ کے رفیق سفر ہو گئے اور آپ اُنھیں لیے ہوئے غار ثور کے کنارے پہونچے اور غار کے اندر داخل ہو گئے۔ (اعلام الورٰی)

مؤرخین اہل سنت کا بیان ہے کہ حضرتؐ مشرکین کے حلقے سے نکل کر خود جناب ابو بکر کے مکان پر گئے اور رات تک وہاں رہے پھر اُن کے ساتھ غار ثور کی طرف تشریف لے گئے۔

(طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۵۳)

مگر حضرتؐ اپنے بیت الشرف سے رات ہی کو تو برآمد ہوئے تھے۔ پھر رات تک خانۂ ابوبکرؓ میں رہنے کے کیا معنی — ؟ اس کے علاوہ صبح ہی کو مشرکین تعاقب کے لیے چل کھڑے ہوئے، اور فطری طور پر مکہ کے تمام ناکوں پر پہرے بٹھا دیے گئے کہ رسولؐ نکل کر جانے نہ پائیں۔ اس حالت میں آپ کا خانۂ ابوبکرؓ سے نکل کر غار ثور تک جانا بالکل قرین قیاس نہیں ہے۔ لہذا درایۃً پہلی ہی روایت حقیقت کے مطابق معلوم ہوتی ہے۔

اب مشرکین حضرتؐ کی تلاش کے لیے نکلے۔ ادھر اُدھر ڈھونڈھا کچھ پتہ نہ چلا تو قیافہ دانوں کی مدد سے جو اپنے فن میں اُس وقت بڑے کمال کے درجہ پر فائز تھے۔ نقش قدم کو پہچانتے ہوئے غار ثور تک آ گئے۔

علامۂ طبرسی لکھتے ہیں کہ خصوصیت کے ساتھ قبیلۂ خزاعہ کا ایک آدمی ابوکرز اس فن میں امتیاز خاص کا حامل تھا اُسے بلایا گیا "فقالوا لہ یا اباکرز الیوم الیوم" اُنھوں نے کہا اے ابوکرز بس آج ہی کا دن ہے، آج ہی کا دن ہے۔ یعنی تمھارے کمال فن دکھانے کا یہی موقع ہے۔ چنانچہ وہ ان کے ساتھ ہوا اور یہ کہتا ہوا کہ دیکھو یہ محمدؐ کے پیر کا نشان ہے اور یہ ابن ابی قحافہ (ابوبکرؓ) کے پیر کا نشان ہے اور یہاں ابن ابی قحافہ کو چلنے میں ٹھوکر لگی ہے۔ برابر اسی طرح وہ سب کو لیے آگے بڑھتا گیا، یہاں تک کہ

سب کو غار کے دروازے پر لاکے کھڑا کر دیا اور کہا کہ چاہے یہاں سے وہ آسمان پر چڑھ گئے ہوں یا زمین میں اُتر گئے ہوں۔ بہر حال وہ دونوں اس جگہ سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔ (اعلام الوریٰ)

عین اُسی وقت غار کے اندر حضرت ابوبکر پر رقّت طاری ہوگئی۔ یہ بڑی خطرناک صورت حال تھی۔ اُدھر قیافہ دانوں کی اپنے مشاہدہ اور علم کی بنا پر سُراغ دہی اور ادھر غار کے اندر سے رونے کی آواز کا بلند ہونا ــــ اس کے بعد مشرکین کو رسولؐ تک پہونچنے میں امر ہی کون مانع ہو سکتا تھا۔ یہی وہ موقع تھا کہ حضرت پیغمبر خداؐ نے اپنے ساتھی سے وہ الفاظ فرمائے جو قرآن مجید میں مذکور ہیں کہ لا تحزن ان اللہ معنا "غم نہ کرو! اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" اور یہ قدرت کا انتظام تھا کہ مشرکین غار کے اندر کی آواز سُن نہیں سکے اور غار کے دہانے پر مکڑی کا جالا اتنی کثرت اور ایسی کیفیت کے ساتھ لگا ہوا دیکھا جس کے متعلق مورخ ابن سعد کے الفاظ یہ ہیں کہ:-

قال بعضهم ان عليه العنكبوت قبل ميلاد محمد۔ (طبقات ج ۱ صـ ۱۵۴)	اُن میں سے بعض نے کہا کہ یہاں تو اتنی شدت سے مکڑیوں نے جالا لگا رکھا ہے کہ شاید حضرت محمدؐ کی پیدائش کے بھی پہلے سے وہ یوں ہی ہے۔

چنانچہ مشرکین سب حیران ہو کر واپس گئے۔ اُن کے جانے کے

بعد رسول ؐ برآمد ہوئے اور مدینہ کی جانب روانہ ہوئے ۔

ابن سعد کا ایک جگہ بیان ہے کہ حضرت ؐ کا غار سے برآمد ہونا، شب دوشنبہ ۴؍ ربیع الاول کو تھا۔ (طبقات ج ۱ ص ۱۵۴) مگر پھر چند ہی سطروں کے بعد یہ لکھا ہے کہ حضرت ؐ مدینہ میں روز دوشنبہ ۲؍ ربیع الاول اور ایک روایت کے مطابق ۱۲؍ ربیع الاول کو پہونچے ۔

علامہ طبرسی لکھتے ہیں کہ آپ مدینہ میں دوشنبہ ۱۱؍ ربیع الاول کو پہونچے ۔ (اعلام الوریٰ)

تاریخ اسلام کی یہ وہ کمزوری ہے جو اس وقت سے لے کر وفات رسول ؐ تک برابر قائم رہی ہے ۔ پھر اس کے بعد کے واقعات میں اگر یہ تاریخ اور دن کا اختلاف نظر آئے تو اس پر حیرت کبھی نہ ہونا چاہیے ۔ اور نہ اس سے اصل واقعات کو مشکوک بنایا جانا درست ہوگا ۔

"مسلمانان عالم" کے مصنف نے لکھا ہے کہ :-

"آپ نے حضرت علی ؑ کو اپنے بستر پر سلایا اور خود ۱۲؍ ستمبر ۶۲۲ء کو تشریف لے گئے ۔ ۱۶؍ ستمبر ۶۲۲ء کو قبا میں پہونچے ۔"

حصۂ اول تمام شد

علی نقی النقوی (علی گڑھ)

۲۸؍ ماہ صیام سنہ ۱۳۸۰ھ

رہنمایانِ اسلام

اس سے قبل مشن سے چہاردہ معصومین علیہم السلام کے مختصر حالات زندگی ایک ایک جزو کے رسائل کی صورت میں علیحدہ علیحدہ پیش کیے جا چکے ہیں، جن کے ہندی اور انگریزی تراجم بھی عرصہ ہوا شایع ہو چکے ہیں یہ رسائل انتہائی مقبول ہیں اور کثیر تعداد میں برابر فروخت ہوتے رہتے ہیں۔

اب یہ جامع کتاب بھی ایک مبسوط مقدمہ کے ساتھ زیر طبع ہے اور انشاء اللہ جلد ہی شایع ہو جائے گی تاکہ ہر معصومؑ کے مختصر حالات یکجا ناظرین کو مل جائیں۔

یقین ہے کہ افراد ملت اپنے اس مشن کی توسیع ممبری، خریداری کتب و رسائل اور عطایا سے امداد فرما کر اس کتاب کو بھی جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہونچانے میں اعانت فرمائیں گے اور عند اللہ و عند الرسولؐ ماجور ہوں گے۔

الداعی الی الخیر

سید ابن حسین نقوی عفی عنہ

آنریری سکریٹری امامیہ مشن، لکھنؤ

پبلشر:۔ مرزا حیدر حسین اسسٹنٹ سکریٹری امامیہ مشن۔ لکھنؤ (انڈیا)

तारीखे इस्लाम

तारीख़ इस्लाम